اقبالِ کامل کا تجزیاتی مطالعہ

ڈاکٹر گلشن طارق

Dr. Gulshan Tariq

Dean of Languages, Lahore Garrison University, Lahore.

Abstract:

This article attempts to analyze Iqbal-e-Kaamil, the creation of Maulana Abdus Salam Nadwi, published in 1948. The book deals with the life history, philosophy, ideology, poetry, prose and almost each and every aspect of the universal poet, Iqbal. It is not only a biography of Iqbal but a portrayal of him as an artist. The writer has discussed Urdu and Persian poetry of Iqbal and given a critique of some of the best of his couplets. Apart from it, certain topics of his poetry like Ego/the Self, loss of the Self, nation, politics and fine arts have been reviewed. This book holds a great significance to understand the creative work of Iqbal. It is a compact study of the personality and writings of Iqbal. To sum up, this article establishes that this book is a comprehensive work on Iqbal.

''اقبال کامل'' مولانا عبدالسلام ندوی کی معرکتہ الارا تخلیق ہے۔ یہ کتاب پہلی بار ۱۹۴۸ء میں شائع ہوئی۔ مصنف نے اقبال جیسے عظیم شاعر کے حالات زندگی، ان کا فلسفہ، نظریات، شاعری، نثر غرض کہ ان کی زندگی کے ہر پہلو پر بات کی ہے۔ ''اقبال کامل'' اقبال پر ایک ایسی جامع کتاب ہے جو تمام حیثیتوں سے کامل ہے۔ یہ کتاب اقبال کی سوانح عمری ہی نہیں بلکہ اس میں عبدالسلام ندوی نے اقبال کو ایک فن کار کے طور پر پیش کیا ہے۔ اس میں اقبال پر ہر طرح کی معلومات جامع طور پر موجود ہیں جو اقبال کے قاری کو ہر طرح مطمئن کرتی ہیں۔ ''اقبال کامل'' میں عبدالسلام ندوی نے اقبال کی اردو، فارسی شاعری پر بحث کی ہے۔ اور ان کے بہترین اشعار کو منتخب کر کے ان پر تبصرہ کیا ہے اور ان کی شاعری کے خاص موضوعات خودی، بیخودی، ملت، سیاست اور فنون لطیفہ کا جائزہ لیا ہے۔

کتاب کے آغاز میں مصنف کا دیباچہ ہے۔اس کے بعد مختلف ابواب بندی ہے۔سوانح حیات، علالت اور وفات، ذاتی حالات، اخلاق و عادات، تصنیفات، اُردو شاعری، فارسی شاعری، کلام اقبال کی ادبی خوبیاں، موازنہ و مقابلہ، کلام اقبال کی مقبولیت، اغلاط، فلسفہ خودی، فلسفہ بیخودی، نظریہ ملت، نظریہ تعلیم، سیاست، صنفِ لطیف (عورت) فنون لطیفہ، نظام اخلاق جیسے موضوعات کو زیر بحث لایا گیا ہے اور پھر خاتمہ کتاب پیش کیا گیا ہے۔سوانح عمری سے زیادہ یہ کتاب اقبال کی تخلیقات کو سمجھنے کے لئے مفید ہے۔اقبال کے متعلق عبدالسلام ندوی جو کچھ بھی جانتے تھے وہ سب انہوں نے کوزے میں سمیٹ دیا ہے۔عبدالسلام ندوی نے جہاں کلام اقبال کو سراہا ہے وہاں اقبال کی لسانی تسامحات کی بھی نشاندہی کی ہے۔

جس وقت عبدالسلام ندوی نے اقبال پر کتاب لکھنی چاہی اس وقت اقبالیاتی ادب مربوط صورت میں بہت کم میسر تھا۔ بلکہ رسائل وغیرہ میں بکھرا پڑا تھا اور اقبال پر چند ایک کتابیں شائع ہوئی تھیں۔ان کے سامنے اقبال پر معلومات کا ایک ذخیرہ بکھرا پڑا تھا جس میں سے وہ اپنی کتاب کے لئے انتخاب کرنا چاہتے تھے تاکہ وہ اقبال پر ایک مربوط اور جامع کتاب لکھ سکیں۔اس بارے میں عبدالسلام ندوی ''اقبال کامل'' کے دیباچے میں رقم طراز ہیں:

> ''اس حیثیت سے میں نے ذخیرہ معلومات پر نگاہ ڈالی تو مجھے محسوس ہوا کہ ڈاکٹر صاحب کے سوانح و حالات پر اگرچہ کوئی مکمل مضمون، کوئی مکمل رسالہ اور کوئی مکمل کتاب نہیں لکھی گئی، تاہم انہی میں اس کا مواد اس کثرت سے موجود ہے کہ ان کو جمع کر کے ڈاکٹر صاحب کے سوانح و حالات کو مکمل صورت میں پیش کیا جا سکتا ہے۔اس لئے میں نے اس مواد کو تقریباً انہی کے الفاظ و عبارت میں مناسب ترتیب کے ساتھ ایک جگہ جمع کر دیا ہے۔''(۱)

عبدالسلام ندوی نے کتاب کی تکمیل کے لئے مختلف اہل علم کو خط لکھے۔انہوں نے ۱۵ اکتوبر ۱۹۴۴ء کو عبدالماجد دریابادی کے نام ایک خط لکھا جس میں وہ لکھتے ہیں:

> ''میں اقبال پر ایک نہایت جامع اور مفصل کتاب لکھنا چاہتا ہوں اور اس غرض سے اقبال کے کلام کے علاوہ ان تمام تصنیفات و مضامین اور لٹریچر کو پڑھنا چاہتا ہوں جو اقبال کے متعلق اردو اور انگریزی میں فراہم ہو گیا ہے۔''(۲)

عبدالسلام ندوی نے ''اقبالِ کامل'' کے مواد کے حصول کے لئے ڈاکٹر سید عبداللہ کے نام بھی خطوط لکھے۔ ۲۸ نومبر ۱۹۴۵ء کو عبدالسلام نے ڈاکٹر سید عبداللہ سے ان کے اقبال پر شائع کردہ مضامین کے حصول کے لئے خط لکھا اس خط میں وہ لکھتے ہیں:

> ''میں ڈاکٹر اقبال پر جو کتاب لکھ رہا ہوں وہ ان شاء اللہ دسمبر ۱۹۴۵ء میں ختم ہو

جائے گی۔اس لئے آپ کے موعودہ مضمون کا شدت سے انتظار ہے۔اگر آپ کے پاس اور کچھ ماخذ ہوں تو ان کے نام سے مطلع فرمایئے تا کہ وہ اگر میرے پاس نہ ہوں تو میں ان کو منگوالوں اور نظر ثانی میں ان سے فائدہ اٹھاؤں۔'' (۳)

عبدالسلام ندوی نے ۱۰ دسمبر ۱۹۴۵ء کو ایک اور خط ڈاکٹر سید عبداللہ کے نام لکھا۔اس خط میں وہ اقبال پر لکھی جانے والی کتاب کا نام لکھتے ہیں:

''اس کتاب کا نام ''مکمل اقبال'' ہوگا اور اس نام سے ظاہر ہے کہ میں نے ان کی زندگی، شاعری، فلسفہ، سیاست، وطنیت اور قومیت ہر چیز کے احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے ،لیکن یہ ضروری نہیں کہ میں جس چیز کو مکمل سمجھ رہا ہوں وہ درحقیقت مکمل ہو اس لئے اگر آپ اپنے معلومات و خیالات سے مستفید فرمائیں گے تو یہ اور مزید تکمیل کا ذریعہ ہوں گے۔'' (۴)

مذکورہ بالا خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ عبدالسلام ندوی جو کام سرانجام دے رہے تھے اس سے ان کو کس قدر دلچسپی تھی اور ''اقبال کامل'' لکھتے وقت انہوں نے کس قدر ذہنی وجسمانی کاوش کی اور کیسی جانفشانی سے کام لیا۔عبدالسلام کی مساعی جمیل سے آخر کار کتاب پایہ تکمیل تک پہنچ گئی۔انہوں نے اپنی اس کتاب کا نام مکمل اقبال سے بدل کر ''اقبال کامل'' رکھ دیا۔جب ''اقبال کامل'' لکھی گئی تو اشاعت سے قبل بہت ضخیم تھی۔مولانا عبدالماجد دریابادی جیسے سخن فہم نے اس کے مسودے پر ناقدانہ نظر ڈالی۔تب اس کی اشاعت کی نوبت آئی۔کتاب کی اشاعت کے وقت مولانا شاہ معین الدین ندوی نے جو اس وقت دارالمصنّفین کے ناظم تھے کتاب میں کانٹ چھانٹ کر دی۔جس سے قاری اس کتاب میں کہیں کہیں تشنگی محسوس کرتا ہے۔''اقبال کامل'' کے سلسلے میں تنقید نگاروں نے عبدالسلام ندوی کی محنت کا اعتراف کیا ہے۔اس کے بعد اقبالیاتی ادب میں بے تحاشہ اضافہ ہوا۔اس کے باوجود ''اقبال کامل'' کی حیثیت ان سب میں آج بھی ممتاز ہے۔اقبال پر لکھنے والوں نے اس کتاب سے بے حد استفادہ کیا۔اقبال پر تحقیق کرنے والوں کے لئے اس کتاب نے رہبر کا کام انجام دیا۔''اقبال کامل'' کی تعریف و توصیف کرتے ہوئے ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم لکھتے ہیں:

''اقبال پر درجنوں کتابیں اور ہزاروں مضامین لکھے گئے ہیں اور بے شمار تقریریں اس پر ہو چکی ہیں۔لیکن یہ سلسلہ نہ ختم ہوا نہ ہوگا۔اقبال پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں محققانہ تصانیف بہت کم ہیں۔میرے نزدیک اقبال پر دو کتابیں نہایت عالمانہ، نہایت بلیغ اور نہایت جامع ہیں۔ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب کی روح اقبال اور مولانا عبدالسلام ندوی کی کتاب اقبال کامل۔ ان دو کتابوں کو ملا کر پڑھیں تو اقبال کے کلام اور اس کی تعلیم کا کوئی پہلو ایسا

دکھائی نہیں دیتا جو محتاج تشریح اور تشنۂ تنقید باقی رہ گیا ہو۔'' (۵)

''اقبال کامل'' کی خوبیاں بتاتے ہوئے پرنسپل عبدالشکور رقم طراز ہیں:

''اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں اقبال کے فلسفہ کے ہر پہلو اور ان کی شاعری پر مفصل نقد و تبصرہ موجود ہے۔'' (۶)

اردو زبان و ادب کی مایہ ناز شخصیت جگن ناتھ آزاد اپنی تخلیق ''تعمیر فکر'' میں عبدالسلام ندوی اور ان کی تخلیق ''اقبال کامل'' کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''اُردو کا ایسا کون طالب علم ہوگا جو مولانا عبدالسلام ندوی (مرحوم) کے علمی اور ادبی کمالات سے واقف نہیں ہوگا... ایک مدت ہوئی عبدالسلام ندوی مرحوم کی کتاب ''اقبال کامل'' میرے زیر مطالعہ رہی۔ میری نظر میں ''اقبال کامل'' (جو علامہ اقبال کی حیات پر مشتمل ہے) اُس وقت بھی اقبال پر لکھی ہوئی بہترین کتابوں میں تھی جو آج بھی اقبال سے متعلق بہترین کتابوں میں ہے۔'' (۷)

''اقبال کامل'' کی تصنیف سے پہلے تک اقبالیاتی ادب میں اقبال کے فلسفہ اور ان کی شاعری پر جو کچھ لکھا گیا عبدالسلام ندوی اس سے مطمئن نہ تھے۔ اس لئے انہوں نے اس میں بہت کچھ اضافے بھی کئے۔ اس ضمن میں وہ ''اقبال کامل'' کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

''ڈاکٹر صاحب کی شاعری اور فلسفہ پر جو کچھ لکھا گیا ہے اس پر مجھ کو بہت کچھ اضافہ کی ضرورت معلوم ہوئی، اور اس کتاب میں، میں نے جو کچھ دماغی کاوش کی ہے وہ صرف اسی حصے کے ساتھ تعلق رکھتی ہے جس کے لئے صرف اخذ و انتخاب کافی نہیں تھا بلکہ ڈاکٹر صاحب کے پورے کلام کے مطالعہ کی ضرورت تھی۔ ڈاکٹر صاحب کا کلام اگرچہ زیادہ تر فلسفیانہ، صوفیانہ، مذہبی، سیاسی اور قومی مسائل پر مشتمل ہے، لیکن یہ مسائل شاعرانہ طرز و اسلوب میں بیان کئے گئے ہیں، اس لئے ان کی تمام حیثیتوں پر شاعرانہ حیثیت کو تقدم حاصل ہے، اور ہم کو ہر موقع پر اسی حیثیت کو پیش نظر رکھنا اور اس کو نمایاں کرنا چاہئے۔'' (۸)

اقبال کی تاریخ پیدائش کے سلسلے میں عرصہ دراز تک بحث و تمحیص کا سلسلہ جاری رہا۔ ان کی پیدائش کے سلسلہ میں کئی مختلف ارائیں و رشواہد پیش کئے گئے۔ کچھ تحقیق نگار اقبال کی تاریخ پیدائش ۱۸۷۳ء اور کچھ ۱۸۷۶ء بھی بتاتے رہے۔ عبدالسلام ندوی نے اقبال کی تاریخ پیدائش ۱۸۷۶ء لکھی ہے۔ حکومت پاکستان نے اس مسئلہ کو حل کرنے کے لئے ایک کمیٹی تشکیل دی جس کی سفارشات پر اقبال کی تاریخ پیدائش کا مسئلہ حل ہو۔ اس ضمن میں ڈاکٹر جاوید اقبال ''زندہ رود'' میں رقم طراز ہیں:

''۹ فروری ۱۹۷۴ء کو کمیٹی کی سفارشات پر حکومت پاکستان نے اعلان کی کہ صحیح

تاریخ ولات ۹ نومبر ۱۸۷۷ء ہے۔'' (۹)

اقبال کے والد نور محمد صوفیانہ مزاج رکھتے تھے اور وہ اپنے بیٹے کو بھی تصوف کا سبق دیتے تھے۔ اقبال کی والدہ انتہائی سوجھ بوجھ کی مالک تھیں اور عبادت گذار تھیں۔ اقبال کو بچپن میں میر حسن جیسا استاد ملا جس نے اقبال کی صلاحیتوں کو نکھار دیا۔ عبدالسلام ندوی ''اقبال کامل'' میں میر حسن کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''مولوی صاحب موصوف کی زندگی خالص علمی زندگی تھی، اور ان کو شعرائے عرب، شعرائے ایران اور شعرائے اردو کے بے شمار اشعار زبانی یاد تھے اور ان کی تعلیم کا یہ خاصہ تھا کہ جو شخص ان سے عربی اور فارسی زبان کی تعلیم حاصل کرتا تھا اس کی طبیعت میں اس زبان کا صحیح مذاق پیدا کر دیتے تھے۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب نے ان کی تعلیم وصحبت سے پورا فائدہ اُٹھایا اور میلان طبیعت کے علاوہ یہ انہی کے فیض صحبت کا اثر تھا کہ جوانی کے زمانے میں ڈاکٹر صاحب کو اساتذہ کے ہزاروں اشعار ازبر یاد تھے۔'' (۱۰)

حکومت وقت نے اقبال کو سر خطاب دینا چاہا تو اقبال نے کہا کہ پہلے میرے استاد کو شمس العلماء کا خطاب دیا جائے پھر میں اپنا خطاب قبول کروں گا۔ اس ضمن میں ''اقبال کامل'' میں مولانا عبدالسلام ندوی لکھتے ہیں:

> ''گورنمنٹ نے جب ڈاکٹر صاحب کو ''سر'' کا خطاب دینا چاہا تو ڈاکٹر صاحب نے اس کو اس شرط کے ساتھ قبول کرنے پر آمادگی ظاہر کی کہ ان کے استاد مولوی سید میر حسن صاحب کو بھی شمس العلماء کا خطاب عطا فرمایا جائے، چنانچہ اس شرط کے مطابق ان کو شمس العلماء کا خطاب دیا گیا۔'' (۱۱)

۱۹۰۵ء میں اقبال اعلیٰ تعلیم کے لئے یورپ چلے گئے۔ اقبال نے انگلستان کے ٹرینٹی کالج میں داخلہ لیا اور ان کے قوانین کے مطابق ایک بار پھر انہیں گریجویشن کرنا پڑی۔ اس ضمن میں جگن ناتھ آزاد اپنی کتاب ''محمد اقبال'' میں لکھتے ہیں:

> ''اقبال اگرچہ ہندوستان سے فلسفے میں ایم اے کی ڈگری لے کے کیمبرج گئے تھے لیکن کیمبرج کے ضابطے کے مطابق انہیں وہاں پھر سے گریجویشن کا امتحان دینا پڑا۔ یہ امتحان انہوں نے امتیاز کے ساتھ پیش کیا۔ ساتھ ہی ساتھ انہوں نے میونک یونیورسٹی میں داخلہ لے کر ایران میں مابعدالطبعیات کے ارتقاء پر ایک مقالہ لکھا جس پر میونک یونیورسٹی نے انہیں ۱۹۰۷ء میں پی ایچ ڈی کی ڈگری عطا کی۔'' (۱۲)

قیامِ انگلستان میں اقبال کی ملاقات میک ڈیگارٹ سے ہوئی جو بے حد مشہور فلسفی تھے۔ اس کے علاوہ فارسی کے مؤرخ اے جی براؤن اور ڈاکٹر نکلسن سے بھی اقبال کی ملاقات انگلستان ہی میں ہوئی۔ انگلستان میں تین برس گذار کر وہ واپس ہندوستان تشریف لائے۔ وطن واپس آ کر وکالت شروع کی اس میں آپ کو کوئی خاص کامیابی حاصل نہ ہوئی پھر گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفہ کے استاد مقرر ہوئے لیکن یہ ملازمت زیادہ دن برقرار نہ رہی۔ اس وقت دنیائے ادب میں اقبال کو اپنی شاعری کی بدولت شہرت حاصل ہو چکی تھی مگر وہ ملکی سیاست سے ابھی دور تھے۔ دوستوں کے اصرار پر ۱۹۲۶ء میں اقبال نے پنجاب لیجسلیٹو کونسل کا الیکشن لڑا اور اس میں کامیابی حاصل کی۔ انھوں نے ۱۹۳۰ء میں الٰہ آباد کے مقام پر ہونے والے مسلم لیگ جلسہ کی صدارت کی۔ اس ضمن میں عبدالسلام ندوی ''اقبال کامل'' میں لکھتے ہیں:

> ''ڈاکٹر صاحب ۱۹۲۶ء میں سیاست کے میدان میں آئے، لیکن تین چار سال کے اندر ہی انہوں نے اپنی محنت، قابلیت اور شہرت کی وجہ سے اس قدر سیاسی وقار حاصل کر لیا کہ دسمبر ۱۹۳۰ء میں مسلم لیگ کے اجلاس الٰہ آباد کے صدر منتخب ہو گئے اور اپنے خطبۂ صدارت میں پاکستان کا نظریہ پیش کیا جس پر قومی اور سیاسی حیثیت سے بہت سے اعتراضات ہوئے، اور اس وقت یہ نظریہ محض شاعرانہ تخیل خیال کیا گیا، لیکن بہت سے مراحل طے کرنے کے بعد یہ مسلمانوں کا متفقہ نظریہ قرار پایا۔''(۱۳)

مدراس میں ایک مسیحی کی بدولت کوئی نہ کوئی عالم مسیحیت پر لیکچر دیتا تھا اس کو دیکھ کر مدراس کے مسلمانوں نے ایک تعلیمی انجمن قائم کی تا کہ مسلمان علماء سے اسلام پر لیکچر دلوائے جائیں۔ پہلے سید سلیمان ندوی نے اور بعد میں اقبال نے ۱۹۲۸ء میں چھ لیکچر دیئے۔ اس ضمن میں عبدالسلام ندوی ''اقبال کامل'' میں لکھتے ہیں:

> ''انہوں نے ۱۹۲۸ء میں انگریزی زبان میں اسلام پر چھ فلسفیانہ لیکچر دیئے جو ''ریکنسٹرکشن آف ریجلس تھاٹ ان اسلام'' کے نام سے ۱۹۳۰ء میں شائع ہوئے۔''(۱۴)

اقبال نے دوسری گول میز کانفرنس میں شرکت کی۔ اس کانفرنس میں اقبال کی ملاقات مشہور فلسفی برگساں سے ہوئی۔ دوسری گول میز کانفرنس کے بعد اقبال لندن سے روم آئے یہاں ان کی ملاقات مسولینی سے ہوئی۔ تیسری گول میز کانفرنس کے بعد اقبال سپین گئے اور وہاں انہوں نے اسلامی تہذیب کے آثار دیکھے۔ سپین میں اقبال کی ملاقات پروفیسر آسین سے ہوئی جس نے اپنی ایک تصنیف میں ثابت کیا تھا کہ دانتے کی تصنیف پر معراج نبویؐ کا اثر صاف نظر آتا ہے۔ انہوں نے مسجد قرطبہ کو

دیکھا تو ان کے دل پر خاص اثر ہوا۔ انہوں نے ''مسجد قرطبہ'' کے نام سے ایک طویل نظم لکھی۔ سپین سے اقبال بیت المقدس تشریف لے گئے اس سفر کے بعد انہوں نے ایک اور طویل نظم ''ذوق وشوق'' لکھی جو اسی سفر کی یادگار ہے۔ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی نظم ''ذوق وشوق'' کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''یہ نظم سفر فلسطین کا حاصل تھی اور ایک ایسا تحفہ جو انہیں سفر کے دوران ہاتھ آیا وطن واپسی پر انہوں نے یہ تحفہ ملت کے سامنے پیش کردیا۔'' (۱۵)

اقبال نے افغانستان کا سفر بھی کیا۔ افغانستان کے فرمانروا نادر شاہ نے ہندوستان سے تین لوگوں کا انتخاب کیا کہ وہ افغانستان آ کر یہاں کی حکومت کو تعلیمی معاملات میں مشورے دے۔ ان میں سے ایک نام اقبال کا تھا۔ اقبال کا سفر افغانستان بے حد کامیاب اور پرلطف رہا۔ افغانستان سے واپسی پر اقبال کی طبیعت خراب رہنے لگی۔ ۱۰ جنوری ۱۹۳۴ء کو نماز عید پڑھی اور گھر آ کر سویوں پر دہی ڈال کر کھایا۔ ان کا گلا پکڑا گیا اور ٹھیک نہیں ہوا۔ انھوں نے جنوری ۱۹۳۵ء میں بھوپال جا کر علاج کرایا لیکن افاقہ نہ ہوا۔ ۱۹۳۶ء کی گرمیوں میں ان کی صحت اس قدر خراب ہوگئی کہ چند قدم چلنا مشکل ہوگیا۔ آخر کار ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو اقبال کی رحلت ہوگئی۔

اقبال نے تین شادیاں کیں۔ ان کی دو بیویاں ان کی زندگی میں ہی وفات پاگئیں۔ آپ کی پہلی بیوی جو آفتاب اقبال کی والدہ تھیں وہ ان کی وفات کے بعد زندہ رہیں اور مارچ ۱۹۴۷ء میں ان کا انتقال ہوا۔ جاوید اقبال کی والدہ اقبال کی دوسری بیوی تھیں۔ اقبال کی تیسری بیوی کا تعلق لدھیانہ سے تھا جن کا ۱۹۲۴ء میں انتقال ہوگیا۔ مئی ۱۹۳۵ء میں والدہ جاوید اقبال کا انتقال ہوگیا۔ اقبال کی لاہور والی بیگم سے دو بچے تھے جاوید اور منیرہ۔ والدہ کے انتقال کے وقت جاوید کی عمر گیارہ برس اور منیرہ کی عمر پانچ سال تھی۔ اقبال کو بچوں کی تعلیم وتربیت کی بہت فکر تھی۔ خاص طور پر چھوٹی بچی کی بہت فکر تھی۔ بچی کی تعلیم وتربیت کے لئے ایک جرمن خاتون کی خدمات حاصل کی گئیں۔ یوں اس کی تعلیم وتربیت کا آغاز ہوا۔ اس ضمن میں ''روزگار فقیر'' جلد اوّل میں فقیر سید وحید الدین رقم طراز ہیں:

> ''۱۹۳۷ء میں منیرہ کی تعلیم کا آغاز ہوا۔ ڈاکٹر صاحب کو اپنی یہ بچی بہت عزیز تھی۔ ڈاکٹر صاحب کے انتقال کے بعد بھی منیرہ کی تعلیم کا سلسلہ جاری رہا اور زیور تعلیم سے آراستہ ہونے کے بعد بڑے ہو کر منیرہ کی شادی ہوگئی۔'' (۱۶)

اقبال کا رجحان تصوف کی طرف تھا لیکن وہ عجمی تصوف کے خلاف تھے اور اسلامی تصوف کو پسند کرتے تھے۔ اس ضمن میں عبدالسلام ندوی ''اقبال کامل'' میں لکھتے ہیں:

> ''وہ اسلامی تصوف کے مخالف نہ تھے بلکہ عجمی تصوف کے مخالف تھے، اور عجمی تصوف کے مسائل میں سے انہوں نے خاص طور پر ان کو لیا تھا جن سے اسلام کی عملی اور مجاہدانہ طاقت کو صدمہ پہنچتا تھا۔'' (۱۷)

اقبال کا اندازِ زندگی انتہائی سادہ تھا۔ یورپ جانے سے قبل وہ شلوار کرتہ پہنتے تھے۔ یورپ میں رہنے کی وجہ سے انگریزی وضع قطع کا لباس پہننے لگے لیکن وہ حقیقتاً فقیر منش تھے۔ چوبیس گھنٹے میں وہ صرف ایک بار کھانا کھاتے تھے۔ ان کی غذا نہایت سادہ تھی۔ عبدالسلام ندوی خلیفہ عبدالحکیم کے حوالے سے''اقبال کامل'' میں اقبال کے اخلاق و عادات کے متعلق لکھتے ہیں:

''ان کی بے نیازی کا یہ حال تھا کہ کھانے کی فکر نہ کپڑے کی۔ خانہ اور اہل خانہ دونوں کی طرف سے بے نیاز معلوم ہوتے تھے۔ ان کا زیادہ وقت مطالعہ میں گذرتا تھا۔ ان کے کلام میں قلندری کا جو ذکر ہے وہ شاعرانہ نہیں، بلکہ حقیقت ہے جو لوگ ان کے پاس رہے ہوں وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ کھانا چوبیس گھنٹے میں ایک دفعہ کھاتے تھے، بہت کم سوتے تھے۔ سحر خیز تھے۔''(۱۸)

اقبال نہایت خوددار انسان تھے۔ ان کے نظریات میں یہ بات بنیاد کا درجہ رکھتی ہے کہ اپنے ہاتھ سے شکار کر کے زندہ رہو۔ اقبال کو شاہین اس لئے پسند تھا کہ وہ کسی کے ہاتھ کا مارا ہوا شکار نہیں کھاتا بلکہ اپنے لئے خود شکار کرتا ہے۔ ایک دفعہ اقبال کے لئے روپیہ اکٹھا کرنے کی تحریک شروع ہوئی تاکہ وہ فکر معاش سے آزاد ہو کر شاعری کریں لیکن انھوں نے اس تحریک کی شدید مخالفت کی۔ اس ضمن میں عبدالسلام ندوی''اقبال کامل'' میں رقم طراز ہیں:

''درویشانہ، حکیمانہ، قلندرانہ زندگی نے ان کو نہایت مستغنی، بے نیاز اور خوددار بنا دیا تھا، چنانچہ ایک بار پنجاب میں یہ تحریک شروع ہوئی کہ دو لاکھ کی رقم جمع کر کے ان کی خدمت میں پیش کی جائے تاکہ وہ فکر معاش سے آزاد ہو کر کلیتہً شعرو سخن کی طرف متوجہ ہو سکیں۔ اخباروں میں بھی اس کا چرچا ہونے لگا لیکن انہوں نے اس تحریک کی سخت مخالفت کی۔''(۱۹)

اقبال نے سوائے نواب بھوپال کے کسی کا وظیفہ قبول نہیں کیا۔ ان دنوں اقبال کی وکالت ختم ہو چکی تھی اور وہ کافی عرصہ سے بیمار تھے۔ اگر ان کے پاس کبھی روپیہ پیسہ ہوتا بھی تو وہ اپنے پاس اُسے جمع نہ کرتے۔ انہیں مال و دولت سے محبت نہ تھی۔ انہوں نے اپنی وصیت میں لکھا کہ میری لائبریری اسلامیہ کالج کو دے دی جائے۔ آپ کی لائبریری میں مختلف زبان وادب کی پانچ سو کتابیں موجود تھیں جو اسلامیہ کالج کی لائبریری کو دے دی گئیں۔ اقبال کی میکلوڈ روڈ والی کوٹھی پر لوگ آتے۔ وہ تنہائی پسند نہیں تھے بلکہ محفل میں بیٹھنا پسند کرتے تھے۔ ان کی گفتگو میں شائستگی ہوتی۔ وہ کسی کا مذاق نہیں اڑاتے تھے۔ ان کی شخصیت بے ریا تھی۔ نہایت نیک نفس تھے۔ حیدر آباد ہائی کورٹ کا جج بننے کے لئے انہوں نے کافی کوشش کی۔ اس عہدے کے لئے اقبال کے توکل، فقر و استغنا کو کوئی منصف نہیں پہنچتا۔ یہ ایک ملازمت ہے اور ہر اہل انسان کا حق ہے کہ وہ اپنے لئے بہتر سے بہتر عہدے کے لئے کوشش کرے۔

اس میں کامیابی یا ناکامی تو بعد کی بات ہے۔

اقبال کی تصنیفات زیادہ تر نظم کی صورت میں ہیں۔ ان کی سب سے پہلے شائع ہونے والی کتاب نثر میں تھی۔ اس کا نام ''علم الاقتصاد'' رکھا گیا۔ ان کے زمانے میں معاشیات کی کوئی کتاب اردو میں نہ تھی۔ معاشی اصطلاحات اور کلیات کو اردو قالب میں ڈھالنے کا مسئلہ اس وقت بہت اہم تھا۔ اقبال کی اس کتاب کو پڑھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا مطالعہ کتنا وسیع تھا۔ یہ کتاب زیادہ مقبولیت حاصل نہ کرسکی اور ان کی زندگی میں یہ کتاب پھر شائع نہ ہوسکی۔ اس کتاب کی زبان اور انداز بیان کافی سلجھا ہوا ہے۔ ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی ''علم الاقتصاد'' کے اسلوب بیان کے بارے میں ان الفاظ میں اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں:

> ''اقبال نے اس کتاب میں شروع سے آخر تک حقائق علمی کی وضاحت کے لئے نہایت، متین اور سنجیدہ اسلوب تحریر اختیار کیا ہے۔''(۲۰)

علم الاقتصاد سے اقبال کے معاشی نظریات کی وضاحت ہوتی ہے۔ ''اقبال کامل'' میں عبدالسلام ندوی نے علم الاقتصاد کے بارے میں نہایت مختصراً لکھا ہے۔ وہ بھی دوسرے تنقید نگاروں کی رائے ہے۔

اقبال اعلیٰ تعلیم کے لئے انگلستان گئے۔ وہاں انہوں نے ''ایران میں مابعد الطبیعات کا ارتقاء'' کے عنوان سے ایک مقالہ لکھ کر میونخ یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ بعد میں انہوں نے یہ مقالہ کتابی صورت میں شائع کیا۔ ۱۳ جنوری ۱۹۰۹ء کو عطیہ فیضی کے نام ایک خط میں اقبال لکھتے ہیں:

> ''ایرانی مابعد الطبیعات پر میری کتاب شائع ہوگئی ہے۔ جلد ہی ایک نسخہ خدمت عالی میں مرسل ہوگا۔''(۲۱)

اس مقالہ کو لکھتے وقت اقبال نے ایران کی ادبی تحریکوں کا وسیع مطالعہ کیا۔ اس مطالعہ کے بعد اقبال اس نتیجے پر پہنچے کہ مسلمانوں کی تباہی اور ان کے زوال میں ایسی شاعری کا بھی ہاتھ ہے جو مسلک گوسفندی پر عمل پیرا ہونے کا مشورہ دیتی ہے۔ اس کا اظہار اقبال نے اپنی مثنوی ''اسرار خودی'' میں کیا جو ۱۹۱۵ء میں شائع ہوئی جو فارسی میں تھی۔ ''اسرار خودی'' کے دیباچے میں اقبال نے حافظ شیرازی پر تنقید کی جو فارسی کے بہت بڑے شاعر ہیں۔ اس تنقید کی وجہ سے اقبال کو شدید مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ اقبال کے نزدیک خودی کے معنی غرور کے نہیں بلکہ خودی سے مراد خود اپنی ذات کی پہچان اور اپنے نفس کا عرفان ہے۔ اس مثنوی کی اشاعت سے اقبال کی حیثیت فلسفی اور مفکر کے طور پر بھی ہوگئی۔

''رموز بیخودی'' کے عنوان سے مثنوی کا دوسرا حصہ ۱۹۱۷ء میں شائع ہوا۔ مثنوی کے دوسرے حصے کی اشاعت کے بعد اقبال کی شاعرانہ عظمت کو نقصان پہنچا۔ بیشتر نقادوں کا کہنا تھا کہ ان کے کلام

میں شعریت بہت کم ہے۔ ۱۹۲۳ء میں اقبال کا ایک اور مجموعہ کلام ''پیام مشرق'' کے نام سے شائع ہوا۔ ''پیام مشرق'' جرمنی کے مشہور شاعر گوئٹے کے ''مغربی دیوان'' کے جواب میں لکھا گیا۔ اقبال نے ۱۰ اکتوبر ۱۹۱۹ء کو سید سلیمان ندوی کے نام ایک خط میں ''پیام مشرق'' کے بارے میں لکھا:

''فی الحال میں ایک مغربی شاعر کے دیوان کا جواب لکھ رہا ہوں جس کا قریباً نصف حصہ لکھا جا چکا ہے۔ کچھ نظمیں فارسی میں ہوں گی کچھ اردو میں۔ کلام کا بہت سا حصہ نظر ثانی کا محتاج ہے لیکن اور مشاغل اتنی فرصت نہیں چھوڑتے کہ ادھر توجہ کر سکوں۔'' (۲۲)

''پیام مشرق'' میں کوئی اردو نظم شامل نہیں۔ اس ضمن میں عبدالسلام ندوی ''اقبال کامل'' میں لکھتے ہیں:

''پیام مشرق'' کا جو نسخہ ہمارے سامنے ہے اس میں اردو کی کوئی نظم نہیں ہے البتہ ''اسرار خودی'' اور ''رموز بیخودی'' نے شاعرانہ حیثیت سے ڈاکٹر صاحب کے کلام میں جو خشکی اور یبوست پیدا کر دی تھی، ''پیامِ مشرق'' نے اس کی تلافی کر دی۔'' (۲۳)

''پیام مشرق'' چار حصوں میں منقسم ہے۔ پہلے حصے کا عنوان لالہ طور ہے۔ اس میں قطعہ نما رباعیاں ہیں۔ دوسرے حصے کا عنوان افکار ہے۔ اس میں مختلف موضوعات پر چھوٹی چھوٹی نظمیں ہیں۔ تیسرے حصے میں خواجہ حافظ کے ایک مشہور ٹکڑے (بدہ ساقی مئ باقی) کو عنوان بنایا ہے۔ چوتھے حصے کا عنوان نقش فرنگ ہے جس میں مغرب کے مشاہیر پر شاعرانہ تبصرے ہیں۔ عبدالسلام ندوی کے مطابق پیام مشرق کی زبان پر لطف ہے۔ اقبال کا تخیل عروج پر ہے۔ غزلوں کا انداز پر جوش اور مستانہ ہے۔

اقبال کا اردو کلام مختلف ادبی رسائل میں شائع ہوتا رہا۔ ۱۹۲۳ء تک اقبال کا کوئی بھی اُردو مجموعہ کلام شائع نہ ہوا۔ سید سلیمان ندوی کے نام اپنے ایک خط میں اقبال لکھتے ہیں:

''مجموعہ اب تک مرتب نہ ہو سکنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اب ان تمام نظموں پر نظر ثانی کرنا چاہتا ہوں جس کے لئے فرصت نہیں ملتی۔ ان شاء اللہ بعد از نظر ثانی شائع کروں گا۔'' (۲۴)

آخر کار ۱۹۲۴ء میں ''بانگ درا'' کے نام سے اقبال کی اُردو شاعری کا پہلا مجموعہ شائع ہو گیا۔ عبدالسلام ندوی نے ''اقبال کامل'' میں بانگ درا کو نہایت مختصراً بیان کیا ہے۔ تقریباً دو لائنوں میں اقبال کے پہلے اُردو مجموعہ کلام سے ان کا یوں گزر جانا مناسب نہیں۔

''زبور عجم'' اقبال کے فارسی مجموعہ کلام کا نام ہے۔ یہ کتاب ۱۹۲۷ء میں شائع ہوئی۔ زجور عجم چار حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں ۶۶ نغمے ہیں۔ دوسرے حصے میں ۷۵ نغمے یا غزلیں ہیں۔

تیسرے حصے کا نام گلشن رازِ جدید ہے چوتھے حصے کا عنوان بندگی نامہ ہے۔ ''زبورِ عجم'' کے پہلے اور دوسرے حصے کے بارے میں عبدالسلام ندوی لکھتے ہیں:

''پہلے حصے میں ۶۶ نغمے ہیں جن کا ظاہری رنگ و روپ تو غزل کا ہے لیکن حقیقت میں وہ وجد آفرین اور پرجوش ترانے ہیں اور ڈاکٹر صاحب نے جیسا کہ وہ خود فرماتے ہیں:

غزل سرائے و نوا ہائے رفتہ باز آور
بایں فسردہ دلان حرفِ دلنواز آور

ان کے ذریعہ سے افسردہ دلان ہند کے قلب میں زندگی کی حرارت پیدا کرنا چاہی ہے۔ دوسرے حصے میں نغمے یا غزلیں ہیں، اور پہلے حصے کے جوش و مستی کا کوئی جواب ہوسکتا ہے تو وہ ڈاکٹر صاحب کے یہی چند غزل نما ترانے ہیں۔'' (۲۵)

محمود شابستری سے کسی نے فلسفہ و تصوف پر کچھ سوالات کیے۔ انہوں نے ان سوالات کے جواب دیئے اور ان جوابات کو انہوں نے ''گلشن راز'' کے عنوان سے شائع کیا۔ اقبال کے نزدیک ''گلشن راز'' میں جو نظریات پیش کئے گئے وہ اسلام کی روح کے خلاف ہیں۔ اقبال نے ان سوالات کے جوابات اسلامی اصولوں کی روشنی میں ''گلشن راز جدید'' میں دیئے۔ اس ضمن میں خلیفہ عبدالحکیم ''فکر اقبال'' میں رقم طراز ہیں:

''اقبال نے یہ ضروری سمجھا کہ جن سوالوں کے جوابات محمود نے اپنے زاویہ نگاہ سے دیئے ہیں انہی سوالوں کے جواب اب اس بصیرت سے دیئے جائیں جو اقبال کو قرآن کریم اور حیات نبویؐ سے حاصل ہوئی۔'' (۲۶)

اقبال کی اگلی تخلیق بھی فارسی زبان میں ہی تھی۔ ''جاوید نامہ'' ۱۹۳۲ء میں چھپ کر دنیا کے سامنے آیا۔ اقبال نے ''جاوید نامہ'' کا خاکہ جرمن مصنف دانتے کی ڈیوائن کامیڈی کو سامنے رکھ کر بنایا۔ عبدالسلام ندوی ''اقبال کامل'' میں لکھتے ہیں:

''اگر جاوید نامہ کا مطالعہ کیا جائے تو یہ مسئلہ صاف طور پر واضح ہو جاتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے ''ڈیوائن کامیڈی''، ''فتوحاتِ مکیہ'' اور ''رسالہ الغفران'' کو سامنے رکھ کر جاوید نامہ کا خاکہ قائم کیا ہے اور ان کے بعض اشارات سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔'' (۲۷)

اقبال نے ''جاوید نامہ'' لکھا تو بقول ان کے دل و دماغ نچڑ گئے۔ یہ ایک عارفانہ تمثیل ہے۔ اس کتاب کا اسلوب بے حد جاذب ہے۔ ''جاوید نامہ'' میں ڈرامائی عناصر ہیں۔ اس ضمن میں ڈاکٹر محمد ریاض رقم طراز ہیں:

''اقبال کی شاعری میں ڈرامائی عنصر خاصا ہے۔مگر جاوید نامہ از اول تا آخر ایک منظوم ڈرامہ ہے۔ یہ ڈرامائی گفتگو شاعر کی غیر معمولی قوت بیان کی مظہر ہے۔ جاوید نامہ مجموعی طور پر المیہ ہے نہ بزمیہ یا رزمیہ۔اسے انسانی یا اسلامی حماسہ کہا جا سکتا ہے اور انگریزی ادب کی رو سے اسے طربیہ و المیہ یا بزمیہ و رزمیہ کا امتزاج کہہ سکتے ہیں۔'' (۲۸)

''جاوید نامہ'' میں اقبال اور رومی کا مکالمہ ہوتا ہے۔شاعر دریا کے کنارے مولانا روم کے اشعار پڑھتا ہے تو رومی کی روح وہاں آ جاتی ہے۔شاعر کی روح کو رومی کی روح آسمانوں پر لے جاتی ہے۔ وہاں مختلف آسمانوں پر شاعر سے دنیا میں جو لوگ نامور تھے، ان کی روحوں سے ملاقات ہوتی ہے۔ان ستاروں سے گذر کر رومی اور شاعر جنت میں داخل ہوتے ہیں۔ایک جگہ پہنچ کر رومی کی روح بھی شاعر کا ساتھ چھوڑ جاتی ہے۔ کیونکہ اللہ کے ہاں ہر ایک کو اکیلے ہی جانا ہے۔''اقبال کامل'' میں مولانا عبدالسلام ندوی لکھتے ہیں کہ دو باتوں سے ''جاوید نامہ'' اور ''ڈیوائن کامیڈی'' ایک دوسرے سے مختلف ہیں:

''جاوید نامہ دو باتوں میں ''ڈیوائن کامیڈی'' اور ''فتوحات'' سے مختلف ہے، ایک یہ کہ اس میں وہ تمثیلی مظاہرات و اشارات نہیں پائے جاتے جو ''ڈیوائن کامیڈی'' اور ''فتوحات'' میں ہر جگہ ملتے ہیں، اور جن کی وجہ سے ان کے بعض مباحث عقدۂ لاینحل ہو کر رہ گئے ہیں۔ دوسرے یہ کہ ڈاکٹر صاحب نے اپنی سیاحت کو زیادہ تر چھ ستاروں تک محدود رکھا ہے، اور دوزخ و اعراف کی سیر نہیں کی ہے، بلکہ جن لوگوں کو جہنم میں مبتلائے عذاب دکھانے کی ضرورت تھی ان کو ''فلک زحل'' کے ایک قلزم خونیں میں مبتلائے عذاب دکھایا ہے، اور وہ لوگ صرف مذہبی یا اخلاقی حیثیت ہی سے مجرم نہیں ہیں بلکہ وہ ایسی ارواح خبیثہ ہیں جنہوں نے ملک وملت سے غداری کی اور جن کو دوزخ نے بھی اپنے اندر لینا قبول نہیں کیا۔'' (۲۹)

اقبال کی شاعری کا دوسرا اردو مجموعہ ''بال جبریل'' کے نام سے جنوری ۱۹۳۵ء میں شائع ہوا۔ اس میں غزلیں، نظمیں اور رباعیات شامل ہیں۔''بال جبریل'' کے پہلے حصے میں ''زبورِعجم'' کی طرح کی کچھ غزلیات ہیں جن دنوں اقبال ''زبورِعجم'' کی غزلیات لکھ رہے تھے انہی دنوں وہ ''بال جبریل'' کی غزلیات بھی لکھ رہے تھے۔شاید ان میں مماثلت کی یہی وجہ ہے۔اس ضمن میں عبدالسلام ندوی ''اقبال کامل'' میں لکھتے ہیں:

''پہلے حصے میں زبورِعجم کے طرز کی کچھ غزلیں، اور پیام مشرق کے طرز کی کچھ

رباعیاں یا قطعے ہیں، اور یہ حصہ گویا زبورعجم کا چربہ ہے، جس میں وہی باتیں الفاظ کا قالب بدل کر دہرائی گئی ہیں اس لئے ان میں زبورعجم کی تمام خصوصیات یعنی جوش، بلندی اور رنگینی سب کچھ موجود ہے۔'' (۳۰)

''بال جبریل'' کے دوسرے حصے میں ''مسجد قرطبہ''، ''ذوق وشوق'' اور ''ساقی نامہ'' جیسی طویل نظمیں ہیں۔ چھوٹی چھوٹی نظمیں بھی کتاب میں موجود ہیں۔ سپین کی سیاحت کے دوران اقبال نے مسجد قرطبہ دیکھی۔ جس کا ان کے دل پر گہرا اثر ہوا۔ اس کا اظہار انہوں نے مسجد پر طویل نظم لکھ کر کیا۔ اقبال کی نظم ''مسجد قرطبہ'' کی تعریف کرتے ہوئے جگن ناتھ آزاد لکھتے ہیں:

''یہ نظم صرف اقبال ہی کا شاہکار نہیں بلکہ ساری اردو شاعری کا شاہکار ہے۔ اردو شاعری میں اس نظم کے سوا کچھ بھی نہیں ہوتا تو بھی ہماری شاعری دنیا کی صف اول کی شاعری میں ایک ممتاز مقام حاصل کر سکتی تھی۔'' (۳۱)

عبدالسلام ندوی کے نزدیک بال جبریل کی غزلیات کو بمشکل غزل کہا جا سکتا ہے:

''ڈاکٹر صاحب کی چند غزلیں بال جبریل کے شروع میں بھی ہیں... زبان اور مضمون دونوں حیثیتوں سے ہم ان کو بہ مشکل غزل کہہ سکتے ہیں۔ غزل کی ایک خاص زبان ہے جو نرم، لطیف، شیریں، خوشگوار اور لوچ دار ہوتی ہے لیکن ان غزلوں کی زبان ان اوصاف سے بالکل خالی ہے۔'' (۳۲)

عبدالسلام ندوی نے غزل کے ضروری لوازمات کو سامنے رکھتے ہوئے کہا کہ ہم انہیں بہ مشکل غزل کہہ سکتے ہیں، لیکن جدید دور میں غزل کے تقاضے ہی بدل گئے اور مولانا حالی کے مطابق قافیہ ردیف کی پابندی اور سنگلاخ زمینوں کی بندش کی وجہ سے شاعر جو مضامین پیش کرنا چاہتا ہے اسے دقت پیش آتی ہے۔ اقبال کے پیش نظر قوم کی اصلاح تھی، اور سینکڑوں مضامین ایسے تھے جو وہ غزل میں پیش کرنا چاہتے تھے۔ اس لئے انہوں نے غزل کے مروجہ قوانین کی زیادہ پابندی نہیں کی۔

''ضرب کلیم'' اقبال کی اردو شاعری کا بہترین مجموعہ ہے۔ یہ کتاب جولائی ۱۹۳۶ء کو شائع ہوئی۔ عبدالسلام ندوی ''اقبال کامل'' میں ''ضرب کلیم'' کو اقبال کی اردو شاعری کا دوسرا مجموعہ قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ یہ تیسرا مجموعہ کلام ہے۔ اس کتاب کا نام پہلے ''صور اسرافیل'' رکھا گیا۔ اس ضمن میں ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی ''تصانیف اقبال کا تحقیقی وتوضیحی مطالعہ'' میں لکھتے ہیں:

'''' ''بال جبریل'' کی اشاعت جنوری ۱۹۳۵ء کے چند ماہ بعد ہی اس قدر اُردو کلام جمع ہو گیا کہ علامہ اقبال نے ''صور اسرافیل'' کے نام سے تیسرے اردو مجموعے کی تیاری شروع کر دی۔ ۱۹۳۶ء کے اوائل میں اسے ''صور اسرافیل'' کی بجائے ''ضرب کلیم'' کا نام دیا گیا۔'' (۳۳)

''ضرب کلیم'' میں نظمیں چھوٹی ہیں۔ ان نظموں میں اقبال نے مختلف موضوعات پر طبع آزمائی کی ہے۔ چھوٹی نظموں کی تعداد ۱۳۹ ہے۔ ضرب کلیم میں عنوانات کی تقسیم کے بارے میں عبدالسلام ندوی ''اقبال کامل'' میں لکھتے ہیں:

''یہ کتاب مختلف عنوانات پر منقسم ہے۔ ابتدائی حصے کا کوئی عنوان نہیں۔ اس میں مختلف چیزوں پر چھوٹی چھوٹی نظمیں ہیں۔ ان کے علاوہ تعلیم و تربیت، عورت، ادبیات، فنون لطیفہ، سیاسیات مشرق و مغرب کے عنوانات سے ہر موضوع پر اسی قسم کی مختصر نظمیں ہیں۔ آخر میں ''محراب گل افغان کے افکار'' کے فرضی نام سے کچھ نظمیں ہیں۔ جن میں بعض ترانہ یا گیت کی شکل رکھتی ہیں اور دلچسپ ہیں لیکن اس کتاب میں شاعرانہ رنگینی اور دل آویزی کم ہے۔'' (۳۴)

''ضرب کلیم'' کی نظمیں فلسفیانہ ہیں، ان میں دروبستگی بھی ہے، ان نظموں میں فکر کی گہرائی ہے، آفاقیت ہے، ڈرامائی کیفیت ہے، معنی آفرینی بھی ہے، تشبیہات و استعارات نے نظموں کو بہت خوبصورت بنا دیا ہے۔

اقبال نے جب افغانستان کا سفر کیا تو اس سفر کے تاثرات اپنی ایک مثنوی ''مسافر'' میں بیان کئے۔ اقبال کی ایک اور مثنوی ''پس چہ باید کرد اے اقوام مشرق'' کے نام سے بھی شائع ہوئی۔ یہ مثنوی ستمبر ۱۹۳۶ء میں شائع ہوئی۔ اقبال بھوپال میں موجود تھے کہ انہوں نے ایک رات سر سید احمد خاں کو خواب میں دیکھا۔ وہ اقبال سے کہہ رہے تھے کہ تم اپنی بیماری کا ذکر حضور سرور کائناتﷺ کے سامنے کرو۔ عبدالسلام ندوی ''اقبال کامل'' میں لکھتے ہیں:

''ضرب کلیم کی اشاعت کے بعد ان کی دوسری فارسی مثنوی ''پس چہ باید کرد اے اقوام مشرق'' کے نام سے ۱۹۳۶ء میں شائع ہوئی۔ اس مثنوی کا شان نزول یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے بھوپال میں ایک رات خواب میں دیکھا کہ سر سید احمد مرحوم ان سے کہہ رہے ہیں کہ تم اپنی بیماری کا ذکر حضور سرور کائناتﷺ کی خدمت میں کیوں نہیں کرتے؟ آنکھ کھلی تو یہ شعر زبان پر تھا:

با پرستا ران شب دارم ستیز
باز روغن در چراغ من بریز

پھر چند اشعار حضورﷺ سے عرض احوال ہوئے۔ رفتہ رفتہ ہند اور بیرون ہند کے سیاسی اور اجماعی حوادث نے ان کو اس قدر متاثر کیا کہ ان کے اشعار نے ایک مستقل مثنوی کی شکل اختیار کر لی۔'' (۳۵)

اقبال کی اردو اور فارسی شاعری کا آخری مجموعہ ''ارمغان حجاز'' کے نام سے شائع ہوا۔ یہ مجموعہ

کلامِ اقبال کی وفات کے بعد نومبر ۱۹۳۸ء میں شائع ہوا۔ عبدالسلام ندوی ''اقبال کامل'' میں لکھتے ہیں:

''ڈاکٹر صاحب کی سب سے آخری کتاب ''ارمغان حجاز'' ہے جو نومبر ۱۹۳۸ء میں شائع ہوئی، اور ایک اور پاک جذبہ اس کی تصنیف کا محرک ہوا، یعنی انہوں نے ۱۹۳۷ء میں فریضہ حج ادا کرنے کی جو تیاریاں شروع کیں، ان کے سلسلے میں وفورِ شوق نے ان کے دل کے درد بھرے ساز کو چھیڑا اور ان کی زبان جوش و مستی میں ترنم ریز ہونے لگی، اور طبیعت میں آمد کا وہ زور پیدا ہوا کہ رباعیوں پر رباعیاں موزوں ہوتی چلی گئیں۔ یہاں تک کہ چند ہی دنوں میں کتاب مکمل ہو گئی اور مسودہ کی ترتیب و تبییض کا وقت آ گیا۔'' (۳۶)

اقبال کے دل میں حرم پاک کی زیارت اور روضہ رسول ﷺ پر حاضری کی بڑی تمنا تھی جو پوری نہ ہو سکی۔ اقبال کے اجداد کشمیری تھے اور ان کو کشمیر سے بہت محبت تھی۔ ''ارمغان حجاز'' کی چند ایک نظموں میں اقبال نے کشمیر اور کشمیریوں کے بارے میں اپنے تاثرات بیان کئے ہیں۔ ''ارمغان حجاز'' میں ''ابلیس کی مجلس شوریٰ'' کے عنوان سے ایک طویل نظم شامل ہے۔ یہ نظم کافی اہمیت کی حامل ہے۔ عبدالسلام ندوی ''ارمغان حجاز'' کی نظموں کے بارے میں ''اقبال کامل'' میں لکھتے ہیں:

''اردو نظمیں اگرچہ تعداد میں کم ہیں لیکن ان میں وہی بلند آہنگی اور جوش بیان پایا جاتا ہے جو زبور عجم اور بال جبریل میں موجود ہے۔'' (۳۷)

مذکورہ بالا تصانیف کے علاوہ اقبال کی اور بھی تصانیف تھیں جو شائع نہ ہو سکیں اور کچھ منصوبے ان کے ذہن میں تھے جو پایہ تکمیل تک نہ پہنچ سکے۔ اقبال رامائن کو اردو میں لکھنا چاہتے تھے اس ضمن میں عبدالسلام ندوی ''اقبال کامل'' میں لکھتے ہیں:

''عہد جہانگیری میں ملا مسیح پانی پتی نے رامائن کو فارسی میں نظم کیا تھا اور اسی کے تتبع میں ڈاکٹر صاحب بھی اُردو میں رامائن لکھنا چاہتے تھے اور اس کے لئے فارسی رامائن کے نسخے کی تلاش تھی۔'' (۳۸)

ان کو اس کا نسخہ کہیں سے نہ ملا۔ اس ضمن میں انہوں نے مہاراجہ کشن پرشاد کو بھی لکھا لیکن ان کے کتب خانے میں بھی فارسی رامائن کا نسخہ موجود نہ تھا۔ اقبال فراموش شدہ پیغمبر کے نام سے ایک کتاب لکھنا چاہتے تھے لیکن یہ کام بھی تکمیل کے مراحل طے نہ کر سکا۔ تصوف سے اقبال کو کافی دلچسپی تھی۔ وہ تصوف کے موضوع پر ایک کتاب لکھنا چاہتے تھے۔ مواد میں فراہمی میں رکاوٹ کے باعث وہ اس کے صرف دو باب لکھ سکے۔ اس لئے یہ کام بھی راستے میں ہی رہ گیا۔ اقبال اپنی آخری کتاب قرآن مجید پر لکھنا چاہتے تھے۔ اس پر انہوں نے کافی غور و فکر کیا لیکن یہ کتاب بھی نہ لکھی جا سکی۔

عبدالسلام ندوی نے ''اقبال کامل'' میں اقبال کی جن تصانیف کا ذکر کیا ہے ان میں ان کے

مقالات لیکچر اور خطوط کے بارے میں کوئی خاص بات نہیں کی۔ حالانکہ اُردو نثر میں اقبال کے مضامین، تقاریظ، دیباچوں، لیکچروں اور خطوط کی کافی اہمیت ہے جن کا انہوں نے مناسب طور پر ذکر ''اقبال کامل'' میں نہیں کیا اور اقبال کی شاعری کے مجموعوں کا ذکر بھی نہایت مختصر طور پر کیا گیا ہے حالانکہ ان پر عبدالسلام ندوی کو تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالنا چاہئے تھی۔

اقبال ابھی میٹرک میں تھے کہ شعر موزوں کرنے لگے۔ وہ مزید تعلیم کے لئے سیالکوٹ سے لاہور تشریف لائے۔ یہاں پر ادبی محفلیں برپا ہوتی تھیں اور اندرون شہر بازار حکیماں میں مشاعرے ہوتے تھے۔ اقبال ان مشاعروں میں شریک ہونے لگے۔ اس ضمن میں عبدالسلام ندوی لکھتے ہیں:

> ''جب ڈاکٹر صاحب ۱۸۹۵ء میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے سیالکوٹ سے لاہور آئے تو ان کی شاعری کی نشوونما کے لئے قدرتی طور پر ایک وسیع فضا مل گئی اور وہ اس مشاعرے میں شریک ہونے لگے اور ان کی شاعرانہ قابلیت نے محفل مشاعرہ کے تمام اراکین کو ان کا مداح اور دوست بنا دیا۔'' (۳۹)

ان مشاعروں کی بدولت اقبال کو مرزا ارشد گورگانی کی صحبت میسر آئی اور وہ ان سے اصلاح لینے لگے۔ اس کے بعد اقبال داغ کے شاگرد ہوئے، اقبال کا داغ کی شاگردی اختیار کرنے کا مقصد یہ تھا کہ ان کی شاعری کی زبان فصیح ہو۔ اقبال پنجابی تھے اور اہل زبان پنجاب کے رہنے والوں کے بارے میں اردو زبان کے سلسلے میں کوئی اچھے جذبات نہ رکھتے تھے۔ اقبال، داغ سے متاثر ضرور تھے مگر جلد ہی انہوں نے اپنے لئے الگ راہ نکالی۔ اقبال نے جو نیا رنگ اختیار کیا اس کے متعلق عبدالسلام ندوی لکھتے ہیں:

> ''اردو شاعری کے نقادوں کا متفقہ بیان ہے کہ یہ غالب کا رنگ تھا جو اس فلسفی شاعری کی افتادِ طبیعت کے بالکل موافق تھا۔'' (۴۰)

پہلے پہل اقبال لاہور کے ایک محدود حلقے تک ہی پہچانے جاتے تھے جن میں زیادہ تعداد طالب علموں کی تھی۔ اقبال انجمن حمایت اسلام کے جلسوں میں شریک ہونے اور اس میں اپنا کلام سنانے لگے۔ عبدالسلام ندوی، اقبال کی پہلی نظم مجمع عام میں پڑھنے کے بارے میں ''اقبال کامل'' میں لکھتے ہیں:

> ''اسی زمانے میں لاہور میں ایک ادبی مجلس قائم ہوئی جس میں مشاہیر شریک ہونے لگے، اور اس میں نثر و نظم کے مضامین کی مانگ ہوئی، ڈاکٹر صاحب نے اسی کے ایک جلسہ میں اپنی وہ نظم جس میں ''کوہ ہمالیہ'' سے خطاب ہے پڑھ کر سنائی، جس میں انگریزی خیالات اور فارسی بندشیں تھیں اس پر مزید یہ کہ وطن پرستی بھی اس میں موجود تھی۔ اس لئے مذاق زمانہ اور ضروریات وقت کے موافق ہونے کی وجہ سے بہت مقبول ہوئی۔ اور کئی طرف سے فرمائشیں ہونے لگیں کہ اس کو شائع کیا جائے، مگر ڈاکٹر صاحب یہ عذر کر کے ابھی نظرِ ثانی کی ضرورت

ہے اس کو اپنے ساتھ لے گئے، اور وہ اس وقت چھپنے نہ پائی۔ لیکن اس کے چند ہی دنوں بعد شیخ عبدالقادر نے اردو ادب کی ترقی کے لئے رسالہ ''مخزن'' جاری کرنا چاہا اور دوستانہ تعلقات کی بنا پر ڈاکٹر صاحب سے وعدہ لیا کہ اس رسالہ کے حصّہ نظم کے لئے وہ نئے رنگ کی نظمیں ان کو دیا کریں گے، تو اس رسالے کے پہلے نمبر کے لئے انہوں نے ان سے ایک نظم مانگی لیکن ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ ''ابھی کوئی نظم تیار نہیں''۔ انہوں نے ہمالیہ والی نظم لینی چاہی لیکن چونکہ ڈاکٹر صاحب کے خیال میں اس میں کچھ خامیاں تھیں، اس لئے انہوں نے اس کے دینے میں پس و پیش کیا۔ بالآخر انہوں نے زبردستی وہ نظم لے لی اور ''مخزن'' کی پہلی جلد کے پہلے نمبر میں جو اپریل ۱۹۰۱ء میں نکلا شائع کر دی۔''(۴۱)

''اقبال کامل'' میں عبدالسلام ندوی سے حقائق کے بیان میں جگہ جگہ غلطیاں ہوئی ہیں۔ انہوں نے تحقیق سے کام نہیں لیا۔ اس طویل اقتباس کو پیش کرنے کا مقصد یہ ہے کہ ''اقبال کامل'' کے مذکورہ بالا اقتباس میں ان سے جو غلطیاں ہوئی ہیں ان کی نشان دہی کی جائے اور حقائق بیان کئے جائیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ اقبال نے اس ادبی مجلس میں جو نظم سب سے پہلے پڑھ کر سنائی تھی وہ ''نالہ یتیم''، تھی دوسری بات یہ کہ عبدالسلام نے ''بانگ درا'' کی پہلی نظم جس کا عنوان ''ہمالہ'' ہے اسے ہمالیہ لکھا ہے۔ یہ بات صحیح ہے کہ اقبال کی جو سب سے پہلی نظم کسی بڑے ادبی رسالے میں شائع ہوئی وہ ''ہمالہ''، تھی۔

''اقبال کامل'' میں لکھا ہے کہ اقبال نے انجمن حمایت اسلام کے ۱۸۹۹ء کے جلسے میں نظم ''نالہ یتیم'' پڑھی۔ حالانکہ یہ نظم انہوں نے ۲۴ فروری ۱۹۰۰ء میں انجمن حمایت اسلام کے پندرھویں سالانہ اجتماع میں سنائی۔ اس ضمن میں خالد اقبال، یاسر ''اقبال اور معاصر ادبی تحریکیں'' میں لکھتے ہیں:

''۱۹۰۰ء میں اقبال نے اپنی نظم ''نالہ یتیم'' پہلی بار انجمن کے اس جلسہ میں پڑھی جس کی صدارت شمس العلما ڈپٹی نذیر احمد نے کی تھی۔ اس طرح انجمن حمایت اسلام سے اقبال کا جو تعلق استوار ہوا وہ تادم مرگ جاری رہا۔''(۴۲)

یورپ جانے سے قبل اقبال بطور شاعر مشہور ہو گئے تھے حالانکہ ابھی تک ان کا کوئی بھی مجموعہ کلام شائع نہ ہوا تھا۔

''اقبال کامل'' میں عبدالسلام نے اقبال کی شاعری کو چار ادوار میں تقسیم کیا ہے۔ ان کی شاعری کا پہلا دور جب سے انہوں نے شاعری کا آغاز کیا تب سے اعلیٰ تعلیم کے لئے یورپ جانے تک کا ہے جو ۱۹۰۵ء تک ہے۔ اقبال نے اس دور میں بچوں کے لئے بھی نظمیں لکھیں اور کچھ انگریزی نظموں کا ترجمہ بھی کیا۔ ان کی یورپ جانے سے قبل کی شاعری میں وطن پرستی کا جذبہ غالب نظر آتا ہے:

سارے جہاں سے اچھا ہندوستان ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ ہے گلستان ہمارا (۴۳)

اقبال کی شاعری کا دوسرا دور شروع ہوا تو ایک تو یہ کہ وہ مصروفیات کے سبب بہت کم شاعری کر پائے دوسرا یہ کہ وہ شاعری سے باغی ہو گئے اور شاعری چھوڑنے کا ارادہ کر لیا۔ اس ضمن میں عبدالسلام ندوی ''اقبال کامل'' میں رقم طراز ہیں:

''اس دور میں انہوں نے بہت کم نظمیں لکھیں۔ بلکہ خود شاعری ہی سے دلبر داشتہ ہو گئے جس کی وجہ بظاہر یہ معلوم ہوتی ہے کہ یورپ میں انہوں نے جو عملی مظاہر دیکھے ایشیائی شاعری اس کے لئے مفید نہ تھی، کیونکہ ایران کے فلسفہ الٰہیات پر انہوں نے جو مقالہ ڈاکٹر کی ڈگری حاصل کرنے کے لئے لکھا اس کے لئے ان کو ایران کے صوفیانہ لٹریچر یا مخصوص صوفیانہ شاعری کا خاص طور پر مطالعہ کرنا پڑا تھا۔ اس مطالعہ سے ان کو معلوم ہوا تھا کہ ایرانی شاعری موجودہ دور جدید کے لئے بالکل موزوں نہیں بلکہ اس کے برخلاف رہبانیت، قناعت اور گوشہ نشینی کی تعلیم دیتی ہے۔'' (۴۴)

آرنلڈ اور شیخ عبدالقادر نے اقبال کو شاعری ترک کرنے کے ارادہ سے باز رکھا۔ یورپ میں رہتے ہوئے اقبال کی زندگی میں ایک دوسرا تغیر بھی ہوا انہوں نے اردو کی بجائے فارسی میں شاعری کے لئے خوب غور و فکر کیا اور وطن واپس آ کر فارسی میں شاعری کا آغاز کر دیا۔ یورپ میں رہتے ہوئے ان کے خیالات میں جو سب سے بڑی تبدیلی آئی وہ وطنیت کی زنجیروں سے آزادی تھی۔ اس ضمن میں ملک حسن اختر ''اطراف اقبال'' میں لکھتے ہیں:

''علامہ اقبال کی زندگی میں انگلستان کا یہ سفر نہ صرف مادی اعتبار سے اہم ہے بلکہ یہ باطنی معنی بھی رکھتا ہے وہ ہندوستان کی جغرافیائی حدود کو توڑ کر آگے بڑھے تو ان کی نظریاتی دنیا میں بھی وسعت پیدا ہوئی۔ اس سفر نے انہیں ہندوستان اور وطنیت کی زنجیروں سے آزاد کر دیا۔'' (۴۵)

اب اقبال نے اسلامی تعلیم کی تبلیغ شروع کی اور انہوں نے ملت بیضا کے لئے کام شروع کر دیا۔ ان کی شاعری میں پیامبر کا انداز پیدا ہو گیا۔ تب انہوں نے ترانہ ملی لکھا:

چین و عرب ہمارا، ہندوستاں ہمارا
مسلم ہیں ہم، وطن ہے سارا جہاں ہمارا (۴۶)

یورپ سے واپسی پر اقبال کی شاعری کا تیسرا دور شروع ہوتا ہے۔ یہ دور دوسرے دو ادوار سے ممتاز ہے۔ اس دور کی نظموں میں فارسیت نمایاں ہے۔ اس دور میں کہی گئی نظموں کے یا تو شروع کے

بند یا پھر آخری بندی فارسی میں ہیں۔ ۱۹۱۱ء میں اٹلی نے طرابلس پر حملہ کیا۔ ان دنوں یورپ کی عیسائی قوتیں ترکی کے حصے بخرے کرنے پر تلی بیٹھی تھیں۔ ان واقعات سے ہندوستانی مسلمانوں کے جذبات کو ٹھیس پہنچ رہی تھی، اقبال نے ان دنوں ''نوید صبح''، ''فاطمہ بنت عبداللہ''، ''شکوہ''، ''جواب شکوہ''، اور ''حضور رسالت مآب ؐ'' کے عنوان سے نظمیں لکھیں۔ ان کی شاعری کا تیسرا دور کافی طویل تھا جو ''طلوع اسلام'' پر جا کر ختم ہوا۔

اقبال کی شاعری کے چوتھے دور میں تین چوتھائی حصہ اسلامی اور ملی شاعری کا ہے۔ ''بانگ درا'' کی اشاعت کے بعد انہوں نے جو کچھ بھی لکھا وہ چوتھے دور کی شاعری میں شمار ہوتا ہے۔

عبدالسلام ندوی ''اقبال کامل'' میں جس موضوع کی طرف بھی آئے ہیں اس پر ان کی گرفت کمزور نظر آتی ہے۔ تصانیف اقبال پر انہوں نے انتہائی ادھوری بحث کی ہے۔ انہوں نے اقبال کی شاعری کے چار ادوار انتہائی مختصراً بیان کئے ہیں۔ اقبال کی غزل پر ان کی بحث بھی قابل تعریف نہیں۔ اقبال کی غزل کی مجموعی طور پر کئی ایک خوبیاں ہیں۔ انہوں نے غزل میں ہر طرح کے مضامین داخل کئے، جن کا ان سے پہلے رواج نہ تھا۔ ان کی غزل میں احساس کی نازک کیفیتیں ہیں، غنائیت ہے، نغمگی ہے، شیرینی اور رمز و ایمائیت ہے۔ اقبال کی غزلیں انسان میں مریضانہ افسردگی پیدا نہیں ہونے دیتیں۔ وہ انسان کو قنوطیت سے بچاتی ہیں اور انسان کے اندر ایک تازہ ولولہ اور جوش پیدا کرتی ہیں۔ اقبال نے غزل کو ایک نیا اور انوکھا انداز بخشا۔ اس ضمن میں ڈاکٹر محمد دین تاثیر ''اقبال کا فکر و فن'' میں لکھتے ہیں:

> ''اقبال کے افکار کی فلسفیانہ ہم آہنگی ان کی غزلیات کو جو متفرق اشعار ہی سے مرتب ہوتی ہیں ایک مربوط غنائیہ بنا دیتی ہیں۔ اس سے غزل کو اس انداز سے کسی نے نہیں برتا۔'' (۴۷)

اقبال نے مرثیہ میں بہت کم طبع آزمائی کی۔ مرثیہ کے لئے ایک خاص مزاج کی ضرورت ہوتی ہے وہ مزاج اقبال کا بالکل نہیں تھا۔ اس ضمن میں عبدالسلام ندوی ''اقبال کامل'' میں رقم طراز ہیں:

> ''ڈاکٹر صاحب نے مرثیے بہت کم لکھے ہیں، اور جو لکھے ہیں ان میں مرثیہ گوئی کی شان بہت کم پائی جاتی ہے۔ وہ ایک ہنگامہ خیز، ولولہ انگیز اور فلسفیانہ طبیعت رکھتے تھے۔ اور مرثیہ میں درد و غم، سوز و گداز اور حرمان و یاس کی ضرورت ہے، اس لئے ان سے یہ صنف بن نہیں آتی۔'' (۴۸)

اقبال نے اپنی والدہ کا مرثیہ ''والدہ مرحومہ کی یاد میں'' کے عنوان سے لکھا ہے۔ انہوں نے سر راس مسعود کا مرثیہ بھی لکھا ہے وہ مرثیہ، مرثیہ نگاری کے فنی تقاضے پورے کرتا ہے۔ انہوں نے آرنلڈ اور غالب کا مرثیہ بھی لکھا ہے۔ عبدالسلام ندوی نے ''اقبال کامل'' میں ان کا ذکر نہیں کیا۔ ''گورستان

شاہی'' اور جزیرہ سسلی پر ان کی نظمیں ملک وقوم کے مرثیے ہیں۔

اقبال نے جس طرح فارسی زبان میں مثنوی لکھی ہے اس طرح اردو زبان میں کوئی خاص مثنوی نہیں لکھی۔اس ضمن میں عبدالسلام ندوی لکھتے ہیں:

> ''ڈاکٹر صاحب نے اردو میں کوئی مستقل مثنوی نہیں لکھی۔البتہ میر حسن کی مثنوی سحر البیان کی بحر میں ایک ساقی نامہ لکھا ہے جو اکثر مثنویوں کا تمہیدی جز و رہا ہے۔''(۴۹)

عبدالسلام ندوی نے ''اقبال کامل'' میں اقبال کی مناظر فطرت سے محبت کا ذکر کیا ہے۔وہی شاعر اپنی شاعری میں مناظر فطرت سے محبت کا اظہار کرتا ہے جو اپنے وطن سے محبت کرتا ہے۔اقبال کی ابتدائی دور کی شاعری میں مناظر فطرت کا بیان جا بجا نظر آ تا ہے۔اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اس دور میں شاعر اقبال وطن کی محبت سے سرشار تھے۔''رخصت اے بزم جہاں''، ''کنار راوی'' اور ''ابر'' وغیرہ جیسی نظموں میں مناظر فطرت کی دلکش اور حسین تصویریں موجود ہیں۔

''اقبال کامل'' میں عبدالسلام ندوی نے اقبال کی رباعیات اور قطعات کا ذکر کیا ہے۔ان کے نزدیک فلسفیانہ اور صوفیانہ خیالات کو حکما اور فلاسفہ نے رباعیات میں بیان کیا ہے، اس لئے اقبال نے بھی ان کی تقلید میں رباعیات لکھی ہیں۔

اقبال نے اپنی ابتدائی شاعری میں وطن کے مسائل اور مشکلات کا بیان کیا۔ان سے پہلے بھی ملک وقوم کے مسائل پر شاعری کی جاتی مگر وہ لمبی داستانیں ہوتیں۔اقبال کی ابتدائی دور کی نظمیں اسی انداز کی ہیں بعد میں اقبال نے محسوس کیا کہ خود اپنی ہستی کا اظہار کرتے رہنا جذبہ خودارادی کے خلاف ہے۔اس سلسلے میں عبدالسلام ندوی ''اقبال کامل'' میں لکھتے ہیں:

> ''مولانا شبلی اور مولانا اسمٰعیل میرٹھی نے اسلاف کے پر فخر کارنامے بھی بیان کئے ہیں اور اس کے ذریعہ سے مسلمانوں کو ان کے تنزل پر شرم وغیرت دلائی ہے، لیکن بہرحال اپنی ہستی کا اظہار، خودداری کے خلاف ہے اور اس سے دلوں میں پست جذبات پیدا ہوتے ہیں اس لئے ڈاکٹر صاحب نے اس انداز کو چھوڑ کر اپنی وطنی اور قومی نظموں کی بنیاد فخر ودعویٰ پر رکھی، جو بلند خیالی کے ساتھ دلوں میں جوش وولولہ پیدا کرتا ہے۔''(۵۰)

''اقبال کامل'' میں عبدالسلام ندوی نے اقبال کی ظریفانہ شاعری کا بھی نہایت مختصر طور پر ذکر کیا ہے ان کے مطابق اقبال نے اکبرالہ آبادی کی تقلید میں ظریفانہ شاعری کی ہے۔عبدالسلام نے اس پر کوئی قابل ذکر روشنی نہیں ڈالی۔صرف اقبال کی ظریفانہ شاعری سے چند ایک مثالیں پیش کی ہیں۔

''اقبال کامل'' میں عبدالسلام ندوی نے ''فارسی شاعری'' کے عنوان سے اقبال کی فارسی شاعری پر تنقیدی

نظر ڈالی ہے۔ اقبال کو فارسی زبان سے خاص رغبت تھی۔ ہندوستان میں مغلیہ سلطنت ایک طویل عرصہ قائم رہی اور مغل حکمرانوں کی زبان فارسی تھی، اس لئے سب دفتری امور فارسی میں ہی انجام دیئے جاتے۔ عبدالسلام کے مطابق تیموریوں کے زمانے میں ہی کشمیر فارسی شاعری کا مرکز بن گیا۔ اقبال کے آباؤ اجداد کا تعلق کشمیر سے تھا۔ اس لئے اقبال میں فارسی زبان کا ذوق تھا۔ اقبال کی ابتدائی دور کی شاعری میں فارسی نظر نہیں آتی مگر یورپ سے واپسی تک اقبال کے خیالات میں بہت بڑی تبدیلی آ چکی تھی۔ اب اقبال پوری دنیا کے مسلمانوں کو ایک قوم تصور کرتے تھے۔ اکثر مسلمان ممالک میں فارسی بولی جاتی تھی۔ اقبال اپنے پیغام کو وسیع پیمانے پر پھیلانا چاہتے تھے۔ اس لئے انہوں نے فارسی میں شاعری کرنے کا فیصلہ کیا۔ اب مذہب کی طرف ان کا رجحان بڑھ گیا۔ اسی بنا پر وہ فارسی شاعری کی جانب متوجہ ہوئے۔ اس ضمن میں عبدالسلام ندوی ’’اقبال کامل‘‘ میں رقم طراز ہیں:

> ’’واقعہ یہ ہے کہ فلسفیانہ اور صوفیانہ خیالات کے ادا کرنے کے لئے دنیا کی زبانوں میں فارسی زبان سے زیادہ بہتر کوئی زبان نہیں۔ عربی زبان نہایت وسیع ہے اور عربی شعراء کی اکثریت کا شمار نہیں بااین ہمہ عربی شاعری فلسفہ وتصوف سے بالکل تہی دامن ہے۔ اس لئے یورپ سے پلٹنے کے بعد جب ڈاکٹر صاحب نے فلسفیانہ خیالات ادا کرنے چاہے تو انہوں نے اردو کو چھوڑ کر اس قسم کی شاعری کے لئے فارسی زبان اختیار کی۔‘‘(۵۱)

فارسی زبان میں شاعری کے آغاز سے پہلے اقبال کا نظریہ ادب برائے ادب تھا لیکن بعد میں ادب برائے زندگی ہو گیا۔

فارسی کلام میں اقبال نے جابجا اس بات کا اظہار کیا کہ وہ مولانا روم سے متاثر ہیں اور ان کے افکار کی پیروی کرتے ہیں۔ اقبال کی فارسی کی پہلی بڑی کاوش مثنوی اسرارِ خودی ہے۔ اس میں انہوں نے مولانا روم کی تعریف کی اور حافظ کی مخالفت کی۔ افکار کی حد تک اقبال مولانا روم سے متاثر ہیں اور زبان و بیان میں وہ حافظ سے متاثر ہیں۔ اس بارے میں مولانا عبدالسلام ندوی ’’اقبال کامل‘‘ میں لکھتے ہیں:

> ’’جہاں تک الفاظ وطرز بیان کا تعلق ہے ڈاکٹر صاحب نے متاخرین شعرائے ایران کی شستہ زبان اور خواجہ حافظ کا پر جوش انداز بیان اختیار کیا ہے، اور اس نے ان کے لہجے میں مولانا روم سے زیادہ مستی اور رنگینی پیدا کر دی ہے۔‘‘(۵۲)

عبدالسلام ندوی نے ’’اقبال کامل‘‘ میں اقبال کی فارسی غزل، رباعی، قطعہ اور مثنوی پر ریویو کیا ہے۔ ان کے نزدیک اقبال کی شاعری جس قدر مختصر ہوتی ہے اسی قدر پر لطف ہوتی ہے۔ اقبال کی فارسی غزل میں سوز و گداز ہے۔ عاشقانہ اور رندانہ مضامین ہیں۔ جتنے رنگا رنگ مضامین اقبال کے ہاں اردو، فارسی شاعری میں ملتے ہیں اور کسی شاعر کے ہاں نہیں ملتے۔

اقبال نے اسرارخودی، رموز بے خودی، مسافر، گلشن راز جدید اور پس چہ باید کرد اے اقوام مشرق کے نام سے مثنویاں لکھیں۔ان فارسی مثنویوں میں وہ شاعرانہ جوش اور لطافت نہیں جو پیام مشرق اور زبور عجم کی شاعری میں ہے۔ان مثنویوں کے ذریعے اقبال کے فلسفیانہ عقائد سے آ گہی ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی ان کی مجددانہ اور مصلحانہ حیثیت بھی ہمارے سامنے آتی ہے۔اقبال بنیادی طور پر ایک شاعر ہیں۔فلسفی نہیں نقادوں نے انہیں ایک فلسفی کے طور پر پیش کیا ہے مگر وہ کبھی بھی فلسفی کہلانا پسند نہیں کرتے تھے۔

عبدالسلام ندوی نے ''اقبال کامل'' میں اقبال کی شاعری کا عمیق مطالعہ کرنے کے بعد ان کی شاعری کی ادبی خوبیاں بیان کی ہیں۔انہوں نے حسن الفاظ، لب و لہجہ، حسن قافیہ و ردیف، تشبیہ و استعارہ، روانی و برجستگی، مدح وذم، تکرار معنی اور رفعت تخیل کے عنوانات کے تحت اقبال کی شاعری کے محاسن اجاگر کیے ہیں۔اقبال نے شاعری میں طرح طرح کے مضامین پیش کئے ہیں۔انہوں نے ان مضامین کو نہایت شاندار الفاظ میں پیش کیا ہے۔انھوں نے شاعری میں مبتذل اور عامیانہ الفاظ استعمال نہیں کئے، بلکہ پرانے الفاظ کو نئے مفاہیم عطا کئے۔ ہزاروں نئے الفاظ اور تراکیب ایجاد کیں۔ علامتوں اور اصطلاحات میں وسعت پیدا کی۔ نئے نئے الفاظ کے استعمال سے ان کی شاعری میں نئی معنویت اور وسعت پیدا ہوئی۔

ایک بڑے شاعر کی پہچان اس کا اسلوب بھی ہوتا ہے اور اقبال کا اسلوب ایسا ہے کہ اقبال کے بعد اس کو اقبال کی مانند کوئی اور استعمال نہیں کر سکا۔اقبال نے اپنی شاعری میں الفاظ کو بڑی خوبصورتی سے برتا ان کے اشعار میں لفظوں کے آہنگ سے موسیقیت پیدا ہوتی ہے۔موسیقی سے اقبال کی اچھی خاصی واقفیت تھی۔ وہ قافیہ، ردیف اور بحور وعروض کے ملاپ سے کلام میں ترنم پیدا کر دیتے تھے۔وہ شاعری میں قافیے کو ضروری خیال کرتے ہیں۔ان کے کلام میں معروف اور غیر معروف دونوں طرح کے قافیے موجود ہیں۔ان کے ہاں جدید قافیوں کی ایک دنیا آباد ہے۔اس سلسلے میں عبدالسلام ندوی ''اقبال کامل'' میں لکھتے ہیں:

> ''ڈاکٹر صاحب غزل، مثنوی، نظم غرض ہر صنف کلام کے لئے قافیہ کو ضروری سمجھتے ہیں اور ان کے ہاں قافیہ کی تمام خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ عام طور پر چند متداول قافیے ہیں جو غزلوں میں عموماً مستعمل ہیں اور ڈاکٹر صاحب نے بھی ان کو استعمال کیا ہے، لیکن اس کے ساتھ ان کے کلام میں بہت سے غیر معروف قافیے بھی پائے جاتے ہیں جن سے جدت اور تازہ کاری کا لطف حاصل ہوتا ہے، مثلاً تیز، رستاخیز، خونریز، تبریز، زرخیز، پرویز کے قافیے۔''(۵۳)

اقبال نے اپنی شاعری میں ایسی بحروں کا انتخاب کیا جس سے ان کے کلام میں روانی

موسیقیت اور ترنم پیدا ہوا۔ اقبال کا تخیل بہت بلند پرواز تھا۔ انہوں نے فلسفہ جیسے خشک مضمون کو بھی رنگین بنا دیا۔ ان کے شعری آہنگ میں قافیہ، ردیف اور بحر و عروض کا بڑا عمل دخل ہے۔ اقبال نے اسلوب شعر میں تشبیہات و استعارات کا بھرپور استعمال کیا۔ اس سے ان کا مقصد کلام میں زور پیدا کرنا نہیں تھا بلکہ ان کے پیش نظر کوئی نہ کوئی مقصد ہوتا تھا۔ اقبال نے تلمیحات کو اپنی شاعری میں بالکل نئے مفاہیم اور نئے انداز کے ساتھ پیش کیا۔ انھوں نے جہاں قرآن و حدیث سے تلمیحات شاعری میں برتیں وہاں انہوں نے تاریخی شخصیات اور مشرق و مغرب کے مفکرین کو بھی اپنے اسلوب شعر کا حصہ بنایا۔ کلام اقبال کی زبان شستہ ہے۔ اس میں جذبہ و اثر کے ساتھ ساتھ تمثیل کاری ہے۔ کہیں کہیں طنز کے نشتر بھی ہیں۔

کسی شاعر کا شعر یا مصرع یا پھر قرآن و حدیث کے کسی ٹکڑے کو اپنی شاعری میں شامل کر لینا تضمین کہلاتا ہے۔ اقبال نے اپنے کلام میں کئی تضمینیں استعمال کی ہیں۔ ان کے کلام میں روانی اور برجستگی نے چار چاند لگا دیئے ہیں۔ اقبال ایک ایسے شاعر ہیں جنہوں نے نہ تو کبھی کسی کی ہجو لکھی اور نہ کبھی کوئی قصیدہ لکھا۔ ان کی شاعری میں اعلیٰ پائے کے مضامین ملتے ہیں۔ اقبال کی شاعری میں تغزل ہے، رعنایت ہے، نغمگی ہے، شرینی ہے، ایمائیت ہے۔ عبدالسلام ندوی نے ''اقبال کامل'' میں کلام اقبال کی ادبی خوبیوں کا بھرپور جائزہ لیا ہے۔ کلام اقبال میں ادبی خوبیوں کے ساتھ ساتھ لفظی و معنوی طور پر کئی غلطیاں بھی ہیں۔ عبدالسلام ندوی نے ''اقبال کامل'' میں کلام اقبال کی غلطیوں اور خامیوں کی نشاندہی کی ہے۔ اس بارے میں عبدالسلام ندوی لکھتے ہیں:

گانا اسے سمجھ کر خوش ہوں نہ سننے والے
دکھے ہوئے دلوں کی فریاد یہ صدا ہے

دکھے بہ تشدید کاف صحیح نہیں۔ بہ تخفیف کاف ہونا چاہئے۔

جب کسی شے پہ بگڑ کر مجھ سے چلاتا ہے تو
کیا تماشا ہے ردی کاغذ سے من جاتا ہے تو

''ردی'' بہ تشدید دال ہونا چاہئے نہ کہ بہ تخفیف دال، ''چلاتا ہے'' بھی پنجابی محاورہ ہے۔

تو طلب خو ہے تو میرا بھی یہی دستور ہے
چاندنی ہے نور تیرا، عشق میرا نور ہے

''طلب خو'' بدنما اور غیر مستعمل ترکیب ہے۔

اس نئی آگ کا اقوام کہن ایندھن ہے
ملت ختم رسل شعلہ بہ پیراہن ہے

اقوام قوم کی جمع ہے اس لئے ''اقوام کہن ایندھن ہیں'' ہونا چاہئے۔

قافلہ ہو نہ سکے گا کبھی ویران تیرا
غیر یک بانگ دار کچھ نہیں سامان تیرا

قافلہ کا ویران ہونا اردو کا محاورہ نہیں، قافلہ لٹنا محاورہ ہے۔'' (۵۴)

مذکورہ بالا غلطیاں ''بانگ درا'' میں ہیں۔ اس کے علاوہ عبدالسلام ندوی نے اقبال کی شاعری کی دوسری کتب میں موجود لفظی غلطیوں کی نشاندہی بھی کی ہے۔ اس بارے میں عبدالسلام ندوی لکھتے ہیں:

''بال جبریل'' اور ''ضرب کلیم'' میں لفظی غلطیاں کم ہیں۔ ایک تو وہی لفظ ''پرہیز'' ہے جس کو ڈاکٹر صاحب نے بال جبریل میں مونث استعمال کیا ہے۔ دوسرا لفظ ''جوہر عورت'' ہے جو ضرب کلیم کے اس شعر میں آیا ہے:

جوہر مرد عیاں ہوتا ہے بے منت غیر
غیر کے ہاتھ میں ہے جوہر عورت کی نمود

کیونکہ عورت کا لفظ جس معنی میں اردو زبان میں مستعمل ہے، فارسی اور عربی میں مستعمل نہیں۔ اس لئے اس کی طرف جوہر کی اضافت غلط ہے۔ لفظی غلطیوں کے ساتھ ساتھ کہیں کہیں معنوی غلطیاں بھی ہیں مثلاً:

چشمۂ دامن میں تر آئینہ سیال ہے
دامنِ موج ہوا جس کے لئے رومال ہے

کوہ ہمالیہ سے خطاب ہے، لیکن چشمۂ دامن ہو یا آئینہ سیال ہو، دونوں کے لئے رومال ایک غیر ضروری اور غیر متعلق چیز ہے۔

دیدۂ بینا میں داغ غم چراغ سینہ ہے
روح کو سامان زینت آہ کا آئینہ ہے

آہ کو آئینہ سے کوئی مشابہت نہیں، اس لئے یہ تشبیہ غلط ہے۔ آہ کو سیاہ چیز سے تشبیہ دی جاتی ہے۔

روکوں نہ دورِ آہ دلِ بیقرار کو
کملی اوڑھاؤں آج شبِ ہجر یار کو

اور آئینہ ایک روشن چیز ہے۔'' (۵۵)

۱۹۱۵ء میں ''اسرار خودی'' کے نام سے اقبال کا پہلا فارسی کلام شائع ہوا۔ اس کتاب کی اشاعت کے بعد اقبال نے ایک فلسفی شاعر کے طور پر شہرت حاصل کی۔ اس مثنوی میں اقبال نے اپنا

فلسفہ خودی بیان کیا۔ انگلستان میں ڈاکٹر نکلسن نے ۱۹۱۹ء میں ''اسرارِ خودی'' کا ترجمہ انگریزی میں کیا۔ اس سے اقبال کی شہرت یورپ میں پھیل گئی۔ اس مثنوی کا دوسرا حصہ ''رموزِ بے خودی'' کے نام سے ۱۹۱۷ء میں شائع ہوا۔

عبدالسلام ندوی کے مطابق اگر انسان اپنی ذات کو پہچان لے اور اپنی ذات کی مخفی صلاحیتوں کو جان لے تو دنیا کے لئے ایک رہبر کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ کچھ لوگوں نے خودی کو غرور اور تکبر کے معنوں میں بھی لیا ہے۔ اس ضمن میں عبدالسلام ندوی ''اقبالِ کامل'' میں رقم طراز ہیں:

> ''خودی سے فخر و تکبر مراد نہیں، بلکہ اس سے وہ استقلال ذاتی مراد ہے جو ہر مخلوق کے علم و عمل کو ایک مخصوص دائرے میں نمایاں کرتا ہے۔ اس کی ذات صفات کی بود و نمود کے مظاہر متعین کرتا ہے۔ اور اس کی نشو و نما اور بالیدگی کے سامان فراہم کرتا ہے، اس لئے وہ جوہر ہے، عرض نہیں، آفتاب ہے، آفتاب کا سایہ نہیں۔ متحرک ہے، ساکن نہیں۔'' (۵۶)

عبدالسلام ندوی نے ''اقبالِ کامل'' میں اقبال کے فلسفہ خودی پر روشنی ڈالتے ہوئے بتایا ہے کہ خودی کے چار عناصر ہیں۔ انہوں نے ''اپنی ذات کی پہچان'' کو خودی کا پہلا عنصر قرار دیا ہے۔ اقبال کی شاعری میں عشق کے موضوع کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ عبدالسلام ندوی کے نزدیک خودی کا دوسرا عنصر ''عقل و عشق'' ہے۔ اقبال کے نزدیک عشق عقل سے برتر ہے۔ اور یہ عشق ہی ہے جس کی بدولت انسان میں مقاصد کی لگن پیدا ہوتی ہے۔ عبدالسلام ندوی کے مطابق فلسفہ خودی کا تیسرا عنصر ''خیر و شر'' ہے۔ اگرچہ شیطان انسان کو بدی کی طرف لے جانے کی کوشش کرتا ہے، مگر بدی کا مقابلہ نیکی کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ فلسفہ خودی کا چوتھا عنصر ''حیات و موت'' اقبال کے نزدیک فطرت زندگی کو ضائع نہیں ہونے دیتی زندگی کا تسلسل برقرار رہتا ہے۔ موت زندگی کے تسلسل کو ختم نہیں کرتی بلکہ زندگی ایک مرحلے سے گذر کر دوسرے مرحلے میں داخل ہو جاتی ہے۔

فلسفہ خودی کو اقبال کے افکار و نظریات میں بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ لفظ ''خودی'' اثبات خودی کا پہلا مقدمہ ہے۔ فلسفہ خودی پر اقبال کی شاعری کی بنیاد کھڑی ہے۔ انسان جب خودی کی پہچان کر لیتا ہے تو پھر وہ نائب حق کے درجے پر فائز ہو جاتا ہے۔ اثبات خودی کا دوسرا مقدمہ ''شرفِ انسانی'' کے نام سے ہے۔ اقبال انسان کو ایک مستقل ہستی تسلیم کرتے ہیں۔ انسان کو کائنات کی تمام اشیاء پر فوقیت حاصل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے اشرف المخلوقات بنا کر دنیا میں بھیجا ہے۔ اس سلسلے میں عبدالسلام ندوی ''اقبالِ کامل'' میں لکھتے ہیں:

1- انسان کو تمام کائنات پر فضیلت حاصل ہے۔

2- وہ فرشتوں پر بھی فضیلت رکھتا ہے۔ فرشتے اگرچہ آسمان سے بھی پرے رہتے ہیں لیکن

ان کی نگاہ بھی انسان ہی کا نظارہ کرتی ہے۔

3۔انسان خدا کا اصلی مطلوب ہے اور وہ اس کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے۔(۵۷)

''تسخیر فطرت'' اثبات خودی کا تیسرا مقدمہ ہے۔کائنات کی اپنی ایک خودی ہے جو ہر چیز کو اپنے اندر جذب کر لیتی ہے۔انسان کی ہستی کائنات میں سب سے کامل ہے۔اس لئے وہ چاہتی ہے کہ وہ تمام دنیا کو اپنے اندر جذب کر لے۔''مسئلہ خیر وشر'' اثبات خودی کا چوتھا مقدمہ ہے۔نیکی اور بدی دونوں زندگی کے لئے لازم وملزوم ہیں مگر خیر، شر پر غالب ہے۔''روح وجسم کا اتحاد'' اثبات خودی کا پانچواں مقدمہ ہے۔اقبال کے مطابق انسان کے جسم کو طاقت ور ہونا چاہئے تا کہ وہ رزم گاہ سے پاؤں پیچھے نہ ہٹائے لیکن صوفیاء کا مسلک ہے کہ انسان کو روحانی طور پر طاقت ور ہونا چاہئے۔

''مسئلہ جبر واختیار'' اثبات خودی کا چھٹا مقدمہ ہے۔تقدیر کا روایتی نظریہ ہے کہ انسان مجبورِ محض ہے۔پہلی بات یہ کہ اقبال کے نزدیک انسان خدا کے مقابلے میں ہیچ اور درماندہ ہے اور دوسری یہ کہ کائنات کے مقابل میں وہ آزاد اور خود مختار ہے۔کائنات کی ہر شے مقررہ راستوں پر چل رہی ہے مگر انسان اس کے مقابلے میں آزاد ہے۔''تخلیق مقاصد'' اثبات خودی کا ساتواں مقدمہ ہے۔انسان اپنے اندر پاکیزہ مفید اور بلند خواہشات رکھے۔خواہشوں کی ایک قسم وہ ہے جو انسان کو تباہ وبرباد کر دیتی ہے۔اس لئے ایسی خواہشات سے بچنا چاہئے۔پاکیزہ خواہشات سے وہ اپنی خودی کی نشوونما کر سکتا ہے۔

''صحرائیت وبدویت'' اثبات خودی کا آٹھواں مقدمہ ہے۔عبدالسلام ندوی کے نزدیک صحرائی زندگی بڑی فطری رہتی ہے اور اس میں کوئی بناوٹ نہیں ہوتی۔مسلمانوں کا ورود صحرائے عرب ہے۔اس لئے اقبال اپنی شاعری میں حجاز کا ذکر بڑی محبت سے کرتے ہیں۔

''عقل وعشق'' اثبات خودی کا نواں مقدمہ ہے۔اقبال نے اپنی شاعری میں عشق کو عقل پر ترجیح دی ہے۔اقبال کے نزدیک عقل عشق کے بغیر کچھ نہیں ہے جب عقل عشق سے دوری اختیار کر لیتی ہے تو اس کی اہمیت ختم ہو جاتی ہے۔''مسئلہ ارتقاء'' اثبات خودی کا دسواں مقدمہ ہے۔یہ عملی زندگی میں خودی کی ترقی اور جدوجہد کی آخری منزل ہے۔اقبال کے نزدیک بے شک فلسفہ اور حکمت نے بہت ترقی کر لی ہے لیکن وہ انسان کامل نہیں پیدا کر سکے۔انسان کامل کا درجہ بہت بلند ہوتا ہے۔وہ زمانہ کی ترقی کا باعث بن جاتا ہے۔

عبدالسلام ندوی نے ''اقبال کامل'' میں اقبال کے فلسفہ خودی کے ماخذ بھی پیش کئے ہیں۔ کچھ تنقید نگاروں نے اقبال کے فلسفہ خودی کے نظریات کو نٹشے سے مستعار جانا اور کچھ نے ان کے ان نظریات کو فشٹے سے ماخوذ جانا۔اقبال نے ان سے انکار کیا اور اس بارے میں وضاحت کی انہوں نے خودی کا جو فلسفہ پیش کیا ہے اس کے تمام بنیادی خیالات وافکار مسلمان حکماء اور صوفیاء سے لیے ہیں۔ان کو صوفیا اور حکما کی جو باتیں قرآن مجید کی تعلیمات کے قریب نظر آئیں۔ان کو حاصل کیا اور خودی کا

ایک سادہ سا خاکہ تیار کیا۔عبدالسلام ندوی کے نزدیک اقبال سے پہلے کسی اور نے خودی اور بےخودی میں ربط وضبط بیان نہ کیا تھا۔اقبال کا کہنا ہے قطرے کو سمندر میں گر کر فنا ہونے کی بجائے موتی بن جانا چاہیئے۔خودی اگر خود مختار ہو تو اس میں غرور کی رمق شامل ہو جاتی ہے لیکن اگر یہ جماعت کے ساتھ وابستہ ہو تو اس سے آپس میں محبت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔

عبدالسلام ندوی نے ''اقبال کامل'' میں اقبال کے مختلف نظریات کی وضاحت کی۔ یہ نظریات ان کے اشعار میں نظر آتے ہیں۔یورپ جانے سے قبل وہ وطنیت کے حامی تھے۔یورپ سے واپسی پر وہ مسلم قومیت کے حامی ہوگئے۔یورپ میں رہنے سے ان کا رجحان فارسی شاعری کی جانب ہو گیا۔عبدالسلام ندوی کے نزدیک یورپ میں رہنے سے اقبال کا ایمان اور پختہ ہوگیا۔تعلیم کے بارے میں اقبال کا نظریہ یہ تھا کہ ایسی تعلیم ہونی چاہیئے جو انسان کی خودی کی تعمیر میں مدد دے۔سیاست کے بارے میں ان کا نظریہ تھا کہ وہ کسی خاندان، شخص یا قوم کی ملکیت نہ ہو۔اس طرح اقبال ملوکیت کے بھی شدید مخالف ہیں۔اس شیطانی نظام سیاست نے انسان کو مذہب اور اخلاق سے بیگانہ کر دیا ہے۔اس نظام سیاست کے علاوہ اقبال مغربی جمہوری نظام کے بھی خلاف ہیں۔اقبال اشترا کی نظام کو کسی حد تک پسند کرتے ہیں۔ان کے خیال میں اشترا کی نظام کی حد تک اسلام کے معاشی نظام کے قریب ہے۔ اقبال نے اپنے اشعار میں اشترا کیت کے مبلغین کارل مارکس اور لینن کی تعریف کی ہے کیونکہ ان کے نزدیک یہ ہستیاں انسانیت کی علم بردار ہیں۔لینن (خدا کے حضور میں) میں اقبال کہتے ہیں:

تو قادر و عادل ہے مگر تیرے جہاں میں
ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات
کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ؟
دنیا ہے تری منتظر روزِ مکافات!(۵۸)

مغرب کے جمہوری نظام کے بارے میں اقبال کہتے ہیں:

تو نے کیا دیکھا نہیں مغرب کا جمہوری نظام؟
چہرہ روشن، اندروں چنگیز سے تاریک تر!(۵۹)

کارل مارکس کے بارے میں علامہ اقبال کہتے ہیں:

وہ کلیم بے تجلی! وہ مسیح بے صلیب!
نیست پیغمبر و لیکن در بغل دارد کتاب!(۶۰)

اقبال عورت کے لئے اسلامی طرز زندگی پسند کرتے ہیں۔ان کے خیال میں عورت کی حیثیت مردوں سے کم نہیں بلکہ بعض معاملات میں مردوں سے بڑھ کر ہے۔حتیٰ کہ جنت بھی ماں کے قدموں تلے ہی ہے۔عبدالسلام ندوی نے ''اقبال کامل'' میں ''فنون لطیفہ'' کے نام سے ایک عنوان قائم

کیا ہے۔ اس میں عبدالسلام ندوی بتاتے ہیں کہ اقبال مشرقی موسیقی کو اس لئے ناپسند کرتے ہیں کیونکہ وہ افسردگی کے جذبات پیدا کرتی ہے۔ اقبال ایسی شاعری کو بھی ناپسند کرتے ہیں جو حزن و یاس پیدا کرے۔ ''نظام اخلاق'' کے نام سے ''اقبال کامل'' میں عبدالسلام ندوی نے ایک عنوان قائم کیا ہے۔ عبدالسلام ندوی نے اقبال کے بارے میں لکھا ہے کہ انہوں نے اسلامی نظام اخلاق کی تعلیم دی۔ ''اقبال کامل'' کا اختتام اقبال کی نعتیہ شاعری پر ہوا ہے۔

''اقبال کامل'' میں کئی ایک جگہ عبدالسلام نے تحقیق سے کام نہیں لیا جس کی وجہ سے ان سے لغزشیں ہوئی ہیں۔ لیکن وقت کے لحاظ سے کہ جب ابھی اقبالیاتی ادب کچھ زیادہ تخلیق نہیں ہوا تھا ان کی اس کاوش کی بے حد اہمیت ہے۔ انہوں نے اقبال کے فلسفہ، اس کے تصورات ونظریات اور اس کی اردو، فارسی شاعری کا بھرپور جائزہ پیش کیا ہے۔ اقبال کے افکار کی اتنی واضح اور اچھی تشریح کی ہے جو اقبال کے کسی اور ناقد کے ہاں نظر نہیں آتی۔ اپنی خوبیوں اور خامیوں سمیت اپنے وقت اور موضوع کے لحاظ سے ''اقبال کامل'' ایک جامع کتاب ہے۔

حوالہ جات

۱۔ مولانا عبدالسلام ندوی، اقبال کامل، لاہور: آتش فشاں پبلی کیشنز، ۱۹۹۲ء، ص:۷

۲۔ نقوش لاہور، خطوط نمبر، جلد اوّل، لاہور: ادارہ فروغ اردو، اپریل / مئی ۱۹۶۸ء، ص:۴۸۹

۳۔ نقوش، مکاتیب نمبر، لاہور: ادارہ فروغ اردو، ۱۹۵۷ء، ص:۵۷۷

۴۔ ایضاً، ص:۱۷۷

۵۔ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم، فکر اقبال، لاہور، بزم اقبال، ۱۹۸۸ء، ص۹۔

۶۔ عبدالشکور، اُردو ادب کا تنقیدی سرمایہ، لاہور: مکتبہ فانوس، ۱۹۹۵ء، ص:۱۴۲

۷۔ جگن ناتھ آزد، تعمیر فکر، جموں، انڈیا: کریسنٹ ہاؤس پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء، ص:۲۱۰

۸۔ مولانا عبدالسلام ندوی، اقبال کامل، لاہور: آتش فشاں پبلی کیشنز، ۱۹۹۲ء، ص:۸

۹۔ ڈاکٹر جاوید اقبال، زندہ رُود، جلد اوّل، لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز، ۱۹۸۵ء، ص:۲۶

۱۰۔ مولانا عبدالسلام ندوی، اقبال کامل، ص:۱۷

۱۱۔ ایضاً، ص:۱۸

۱۲۔ جگن ناتھ آزاد، محمد اقبال ایک ادبی سوانح حیات، لاہور: اقبال پبلی کیشنز، س ن، ص:۵۶

۱۳۔ مولانا عبدالسلام ندوی، اقبال کامل، ص:۳۴

۱۴۔ ایضاً، ص:۳۳

۱۵۔ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، اقبال کی طویل نظمیں، لاہور: گلوب پبلشرز، ۱۹۷۰ء، ص:۱۳۴

۱۶۔ فقیر سید وحید الدین، روزگار فقیر، جلد اوّل، لاہور: آتش فشاں پبلی کیشنز، ۱۹۸۸ء، ص:۲۰۳

۱۷۔ مولانا عبدالسلام ندوی، اقبال کامل، ص:۶۳

۱۸۔ ایضاً، ص:۸۳

۱۹۔ ایضاً، ص:۸۴،۸۵

۲۰۔ ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی، عروج اقبال، لاہور: بزم اقبال، ۱۹۸۷ء، ص:۱۸۲

۲۱۔ مظفر حسین برنی، کلیات مکاتیب اقبال جلد اوّل، لاہور: ترتیب پبلشرز، س ن، ص:۱۵۴،۱۵۵

۲۲۔ ایضاً، ص:۸۸

۲۳۔ مولانا عبدالسلام ندوی، اقبال کامل، ص:۹۹

۲۴۔ مظفر حسین برنی، کلیات مکاتیب اقبال، جلد دوم، ص:۴۳،۴۴

۲۵۔ مولانا عبدالسلام ندوی، اقبال کامل، ص:۱۰۲

۲۶۔ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم، فکر اقبال، ص:۵۲۵

۲۷۔ مولانا عبدالسلام ندوی، اقبال کامل، ص:۱۰۴

۲۸۔ ڈاکٹر محمد ریاض، جاوید نامہ تحقیق و توضیح، لاہور: اقبال اکادمی، ۱۹۸۸ء، ص:۱۳

۲۹۔ مولانا عبدالسلام ندوی، اقبال کامل، ص:۱۰۴

۳۰۔ ایضاً، ص:۱۰۶

۳۱۔ جگن ناتھ آزاد، اقبال اور اس کا عہد، لاہور: الادب، ۱۹۷۷ء، ص:۱۰۱

۳۲۔ مولانا عبدالسلام ندوی، اقبال کامل، ص:۱۴۱

۳۳۔ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، تصانیف اقبال کا تحقیقی و توضیحی مطالعہ، لاہور: اقبال اکادمی، ۱۹۸۲ء، ص:۳۴،۳۵

۳۴۔ مولانا عبدالسلام ندوی، اقبال کامل، ص:۱۰۷

۳۵۔ ایضاً، ص:۱۰۷

۳۶۔ ایضاً، ص:۱۰۷

۳۷۔ ایضاً، ص:۱۳۱

۳۸۔ ایضاً، ص:۱۰۸

۳۹۔ ایضاً، ص:۱۱۲

۴۰۔ ایضاً، ص:۱۳۵

۴۱۔ ایضاً، ص:۱۱۳،۱۱۴

۴۲۔ خالد اقبال یاسر، اقبال اور معاصر ادبی تحریکیں، لاہور: اقبال اکادمی، ۱۹۹۴ء، ص:۱۷

۴۳۔ محمد اقبال، کلیات اقبال (اُردو)، لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز، ۱۹۸۲ء، ص:۸۳

۴۴۔ مولانا عبدالسلام ندوی، اقبال کامل، ص:۱۲۲

۴۵۔ حسن اختر ملک، اطراف اقبال، لاہور: مکتبہ میری لائبریری، ۱۹۷۲ء، ص:۳۷

۴۶۔ محمد اقبال، کلیاتِ اقبال (اُردو)، ص:۱۵۹

۴۷۔ ڈاکٹر محمد دین تاثیر، اقبال کا فکر و فن، مرتبہ: افضل حق قریشی، لاہور: یونیورسل بکس، ۱۹۸۸ء، ص:۱۶۵

۴۸۔ مولانا عبدالسلام ندوی، اقبال کامل، ص:۱۴۲

۴۹۔ ایضاً، ص:۱۴۶

۵۰۔ ایضاً، ص:۱۵۱

۵۱۔ ایضاً، ص:۱۵۸

۵۲۔ ایضاً، ص:۱۶۰، ۱۶۱

۵۳۔ ایضاً، ص:۱۹۶

۵۴۔ ایضاً، ص:۲۳۷

۵۵۔ ایضاً، ص:۲۳۸

۵۶۔ ایضاً، ص:۲۴۱

۵۷۔ ایضاً، ص:۲۴۶

۵۸۔ ڈاکٹر علامہ محمد اقبال، کلیاتِ اقبال (اُردو)، ص:۴۰۰

۵۹۔ مولانا عبدالسلام ندوی، اقبال کامل، ص:۶۵۰

۶۰۔ ایضاً، ص:۶۵۰

☆......☆......☆